مولانا حمید الدین فراہیؒ



محمد عنایت اللہ سبحانی

البدر پبلی کیشنز
۴۰-بی-اردو بازار-لاہور

علامہ حمید الدین فراہیؒ

- ایک عظیم مفسّر
- ایک مایۂ ناز محقّق
- ایک بلند پایہ مجدّد

محمد عنایت اللہ سبحانی اصلاحی

البدر پبلی کیشنز۔ ۴۔ بی، اردو بازار لاہور

اشاعت اوّل ——— جنوری ۱۹۸۰ء

تعداد ——— ۱۱۰۰

ناشر ——— عبدالحفیظ احمد

طابع ——— محبوب پرنٹنگ کارپوریشن لاہور

کتابت ——— محمد اسلم طور

قیمت ———

البدر پبلی کیشنز ۔ ۳ بی اردو بازار لاہور

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

دیباچہ

اس چودھویں صدی ہجری کی دو شخصیتیں ایسی ہیں، جن سے طبیعت غیر معمولی طور سے متاثر ہوئی، زمانہ دونوں کا ایک تھا، مگر وطن دو تھا، ایک مصر کی تھی، دوسری ہندوستان کی، ایک کا نام حمید الدین فراہی تھا، دوسری کا نام حسن البناء شہید، ایک قرآن کا محرم اسرار اور علوم کا سمندر تھا، دوسرا میدان عمل کا شہسوار اور وقت کا قلندر تھا، ایک کے ہاں قرآنی معارف کی بہار تھی، دوسرے کے ہاں جہاد حق کی للکار تھی۔ ایک کے ہاں ابوبکر صدیقؓ کا فہم و تبحر تھا، دوسرے کے ہاں عمر فاروقؓ کا جلال و جمال تھا، کام دونوں کا ایک تھا، مگر کام کے میدان دو تھے، دونوں وقت کے براہیم اور زمانے کے بُت شکن تھے، ایک نے علوم کے صنم کدے میں اذان دی، دوسرے نے میدان عمل کے طاغوتوں سے جنگ کی، ایک کی کوشش یہ تھی کہ قرآن ہی ہمارے تمام علوم کا منبع اور محور اور سارے فنون کا ماخذ و مرکز ہو، دوسرے کی تمنا یہ تھی کہ قرآن ہی حکومت کا نظام اور وقت کا امام ہو، ایک کی آواز یہ تھی کہ ذہنی اور فکری گمراہیوں کا سدّباب کر دیا جائے، دوسرے کی کوشش یہ تھی کہ میدان عمل سے باطل کو بے دخل کر دیا جائے، منزل دونوں کی ایک تھی، مگر خدا داد

صلاحیتوں کے لحاظ سے دونوں کے میدان کار دو تھے، ایک کے اندر معلمانہ عظمت اور محققانہ وقار تھا، دوسرے کے اندر قیادت کی آن بان اور خلافت کی شان تھی، ایک کے اندر تاروں کی خامشی اور چاند کی ضیا پاشی تھی، دوسرے کے اندر سورج کی آب وتاب اور طوفان کی سطوت تھی، ایک علوم کا مجدّد تھا، دوسرا میدان عمل کا مجاہد تھا، اس لحاظ سے دونوں ملت کے محسن اور وقت کے امام تھے، دونوں کا یہ مقام تھا کہ ان کے افکار و نظریات کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جاتے، اور شخصیتوں کی تعمیر میں ان کی زندگیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاتے۔

یہی احساس تھا جو اس تحریر کا محرک ہوا، ہم سر دست علّامہ حمید الدین فراہیؒ کی بوقلموں شخصیت اور ان کے قیمتی افکار و نظریات کا ایک مختصر سا تعارف ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں، آئندہ اگر خدا کی توفیق شامل حال رہی تو ہم ان کے قرآنی افکار اور تفسیری کارناموں کا ایک مفصل اور جامع تذکرہ ہدیۂ ناظرین کریں گے، وما توفیقی الّا باللہ۔

علّامہ حمید الدین فراہیؒ

علّامہ حمید الدین فراہی ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں پھریہا میں پیدا ہوتے، ولادت باسعادت ۱۲۸۰ھ میں ہوئی، علّامہ کا گھرانہ ضلع کے معزز گھرانوں میں شمار ہوتا تھا، فضل وکمال اور دنیوی وجاہت کے اعتبار سے پہلے سے

نیک نام تھا، مولانا شبلی نعمانی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، رشتہ میں وہ علامہ فراہی کے ماموں زاد بھائی تھے۔

علامہ فراہی کا نام عبدالحمید بھی تھا اور حمید الدین بھی چونکہ عربی قاعدہ کے لحاظ سے لقب ہے، اس لیے خاکساری کی وجہ سے علامہ موصوف اپنے پہلے ہی نام کو پسند فرماتے تھے اور تصنیفات کے سرورق پر عبدالحمید ہی لکھواتے تھے۔

ابتدائی تعلیم

علامہ فراہی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، پہلے انھوں نے قرآن پاک حفظ کیا، پھر فارسی سیکھی، کچھ ہی دنوں میں فارسی پر اتنا عبور حاصل ہو گیا کہ اس میں اشعار بھی کہنے لگے، قدرت نے شروع ہی سے موزوں طبیعت عطا کی تھی، بہت ہی مختصر مدت میں زبان سے گہری مناسبت پیدا ہو گئی، وہ ایرانی اساتذۂ فن کے رنگ میں قصیدے کہنے لگے۔

علامہ فراہی نے اسی ابتدائی دور میں فارسی میں ایک قصیدہ لکھا تھا، مولانا شبلی نعمانی نے اپنے استاد مولانا فاروق چریا کوٹی کی خدمت میں اُسے پیش کیا اور علامہؒ کا نام بتائے بغیر پوچھا: یہ کس کا کلام ہو سکتا ہے؟ مولانا فاروق چریا کوٹی اپنے زمانہ کے مشہور استاذ فن اور ممتاز نقاد سخن تھے، وہ دیر تک قصیدے کو بغور دیکھتے رہے، پھر فرمایا: میں یہ تو نہیں بتا سکتا یہ کس کا کلام ہے، البتہ اس میں قدیم اساتذۂ فن کی شان نمایاں ہے، مولانا شبلی نے فرمایا: یہ حمید کا ہے، سن کر وہ حیران رہ گئے۔

عربی تعلیم

علامہ فراہی نے عربی زبان زیادہ تر مولانا شبلیؒ سے ہی سیکھی، مولانا شبلی علامہ فراہی سے ۶ سال بڑے تھے خداداد ذہانت، بے پناہ محنت اور ارباب کمال کی صحبت کا کرشمہ تھا کہ اس وقت تک وہ عربی علوم میں خاصی قابلیت پیدا کر چکے تھے، مولانا شبلی کو علامہ فراہی سے بڑا تعلق خاطر تھا، کیوں کہ ان کی دُور رس نگاہوں نے شروع میں ہی اس جوہر قابل کو تاڑ لیا تھا، جس کا اندازہ مولانا شبلی کے اس ایک جُملے سے کیا جا سکتا ہے، انھوں نے علامہ فراہی سے کسی موقع پر فرمایا: "مَیں سچ کہتا ہُوں کہ مَیں تمھارے وجود کو اپنی تمام برادری کے لیے تاجِ عزت سمجھتا ہُوں، اس غیر ضروری اظہار کی ضرورت یہ ہے کہ تم اپنی صحت کا خیال رکھو" —— انھوں نے ایک شفیق اور مہربان بھائی کی طرح بڑی ہی دلچسپی اور سرگرمی کے ساتھ اپنے ہونہار بھائی کو عربی سکھائی، صرف و نحو اور ادب و معقولات کی تعلیم علامہ فراہی نے مولانا شبلی سے ہی حاصِل کی۔ غیر معمولی ذہانت و عبقریت کی وجہ سے بہت جلد ان تمام علوم میں دستگاہ حاصِل کر لی۔

مولانا شبلی سے اکتساب فیض کرنے کے بعد علامہ فراہی کو دوسرے مشاہیر کے حلقہ ہائے درس سے استفادہ کا خیال ہُوا، اس وقت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے حلقۂ درس کی بڑی شہرت تھی، علامہ نے کچھ دنوں ان کے حلقۂ درس میں شرکت کی، مگر چونکہ طبیعت شروع سے ہی محققانہ تھی اور مولانا شبلی کے فیض صحبت

نے یہ رنگ اور نکھار دیا تھا، اس وجہ سے علامہ کو وہاں آسودگی نہ حاصل ہوئی، وہ واپس چلے آئے۔

لکھنؤ سے واپس آنے کے بعد لاہور کا سفر کیا، لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارن پوری تھے، اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے، عربی کا اچھا ذوق رکھتے تھے، پورے ملک میں ان کی شہرت تھی، عربی ادب میں وہ مولانا شبلی کے بھی استاد تھے، علامہ فراہی مولانا سہارن پوری کی خدمت میں حاضر ہوتے، اِن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، مولانا سہارن پوری کی باریک بین اور قیافہ شناس نگاہوں نے اس گوہر یگانہ اور لعل گراں مایہ کو پہچان لیا، وہ بڑی شفقت سے پیش آئے، بڑی فراخ دِلی کے ساتھ علامہ فراہی کو علومِ ادب کی تکمیل کرائی۔

استاد کی نگاہ میں شاگرد کی جو وقعت و عزت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا سہارن پوری نے سبعہ معلقہ کی جو شرح لکھی تھی، اس کا مسودہ جو خود ان کے اپنے قلم سے لکھا ہوا تھا، علامہ فراہی کو بطور یادگار مرحمت فرمایا اور اس پر اپنے قلم سے عزیز شاگرد کے لیے چند تعریفی کلمات لکھے جو انتہائی شاندار اور وقیع اور علامہ فراہی کی عظمت کے آئینہ دار تھے۔

انگریزی تعلیم

عربی زبان اور دینی علوم کی تحصیل سے فراغت ہوئی تو کم و بیش بیس۲۰ سال کی عمر میں علامہ فراہی انگریزی تعلیم کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخل ہوئے، اس وقت تک علامہ فراہی کو عربی اور فارسی میں جو مہارت حاصل

ہوچکی تھی، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود سرسید نے علامہ کے لیے انگریز پرنسپل کو سفارشی خط لکھا، اس خط میں یہاں تک لکھ دیا کہ میں آپ کے پاس ایک ایسا لڑکا بھیج رہا ہوں جو عربی اور فارسی پر اتنا حاوی ہے کہ یہاں کے طلبہ تو کیا، پروفیسروں میں بھی کوئی اس کی ٹکر کا نہیں، اس زمانہ میں کالج کے پروفیسروں میں مولانا شبلی نعمانی جیسے ماہرین زبان اور اساتذۂ فن شامل تھے، انگریز پرنسپل کو سرسید کی یہ بات ناگوار گزری، وہ خط لیے ہوئے مولانا شبلی کے پاس پہنچا، اس نے خط دکھاتے ہوئے کہا: یہ سرسید نے ایک طالب علم کے بارے میں کیا بات لکھ دی، کیا یہاں کے عربی و فارسی کے پروفیسر ایک کمسن طالب علم کے برابر بھی صلاحیت نہیں رکھتے؟ کیا یہ آپ جیسے اساطین علم کی توہین نہیں ہے؟ علامہ شبلی مسکرائے، نہایت پرلطف انداز میں بولے: "بلاشبہ آپ لوگوں کے لیے تو یہ بات توہین کی ہو سکتی ہے لیکن میرے لیے تو یہ باعثِ فخر ہے، سرسید کے یہ ممدوح عربی و فارسی دونوں زبانوں میں میرے شاگرد ہیں"

طالب علمی ہی کے زمانہ میں سرسید نے علامہ سے طبقات ابن سعد سے سیرت نبوی کا کچھ حصہ فارسی میں ترجمہ کرایا، ترجمہ اس قدر معیاری تھا کہ سرسید نے اسے بہت پسند کیا اور کالج کے نصاب میں داخل کر دیا۔

اسی زمانہ میں سرسید مرحوم امام غزالیؒ کا کوئی قلمی رسالہ چھپوانے کا اہتمام کر رہے تھے، وہ نسخہ نہایت کرم خوردہ تھا، اس کی تصحیح و تہذیب کے لیے وہ روزانہ کچھ دیر مولانا شبلی اور غالباً مولانا حالی کو ساتھ لے کر بیٹھتے، مختلف نسخوں

سے اسے ملاتے اور سیاق وسباق سے اس کی کٹی ہوئی عبارتیں درست کرنے کی کوشش کرتے، لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا، ان بزرگوں سے کچھ آگے نہیں سرک رہا تھا، بالآخر ایک روز مولانا شبلی نے سرسید مرحوم سے کہا: "یہ کام حمید کو دے دیجیے، وہ کردیں گے۔" سرسید سخت حیران ہوئے کہ جو کام حالی وشبلی جیسے اساتذۂ فن سے نہیں بن پارہا ہے، وہ ایک طالب علم سے کیسے ہو جائے گا۔

لیکن مولانا شبلیؒ کے کہنے پر ایک روز سرسید نے علامہ فراہی کو بلا بھیجا اور کتاب کا نسخہ ان کے حوالہ کرتے ہوئے فرمایا: اس کے بعض مقامات پر جہاں الفاظ کٹے ہوئے ہیں، مَیں نے نشان لگا دیے ہیں، آپ غور کرکے متعین کیجیے کہ ان مقامات پر کیا الفاظ مناسب رہیں گے۔

علامہ فراہی کتاب لے کر چلے آئے اور اس کا مطالعہ کرکے اپنے ذوق سے ہر جگہ مناسب عبارتیں لکھ دیں، چند دنوں بعد جب کتاب سرسید کے حوالہ کی تو انھوں نے کتاب کے دوسرے نسخوں سے نشان زدہ مقامات ملائے، سرسید مرحوم کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے نشان زدہ مقامات میں علامہ کا ذوق اور قیاس یا تو دوسرے نسخوں کے بالکل مطابق ہے یا کم از کم ان سے قریب تر ہے۔

سرسید مرحوم علامہ کی اس حیرت انگیز صلاحیت وذہانت سے نہایت مرعوب ہوئے، پوچھا: ان عبارتوں کی تعیین میں آپ کو کس چیز سے رہنمائی حاصل ہوئی ہے؟

علامہ نے فرمایا: سیاق کلام اور امام غزالی کا اسلوب بیان، یہی دونوں چیزیں میرے سامنے رہی ہیں، ان ہی کی مدد سے مَیں نے یہ عبارتیں متعین کی ہیں۔

علی گڑھ میں علامہ فراہی نے انگریزی اور دیگر علوم کے علاوہ فلسفۂ جدیدہ پر خصوصی توجہ دی، اور اس میں امتیاز حاصل کیا، اس زمانہ میں وہاں فلسفہ کے پروفیسر مشہور انگریز مستشرق ڈاکٹر آرنلڈ تھے، علامہ نے فلسفہ کی تعلیم تو ان سے ضرور حاصل کی، لیکن ان سے خوش نہیں تھے، وہ آرنلڈ کو بھی اسی بساطِ سیاست کا ایک مہرہ سمجھتے تھے جو انگریزوں نے علی گڑھ میں بچھا رکھی تھی، علی گڑھ کا حلقہ ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کا بڑا مداح تھا، لیکن علامہ اس کتاب کے سخت مخالف تھے، وہ فرماتے: یہ کتاب مسلمانوں کے اندر سے رُوحِ جہاد ختم کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔

بی، اے کی ڈگری علامہ نے الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی، اس کے بعد ایم۔ اے کی بھی تیاری کی، لیکن کسی وجہ سے اس کے امتحان میں نہیں بیٹھے۔

مدرسۃ الاسلام کراچی میں

علامہ فراہی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے مدرسۃ الاسلام کراچی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، یہاں انھوں نے کئی سال بسر کیے، غالباً اسی زمانہ میں (۱۹۰۰ء میں) ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن نے عرب سرداروں سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کے لیے سواحل عرب اور خلیج کا سفر کیا، اس سفر میں ترجمانی کے فرائض انجام دینے

کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بیک وقت انگریزی اور عربی دونوں زبانوں کا ماہر ہو، اس کے لیے نظر انتخاب علاّمہ فراہی پر پڑی۔
علاّمہ یہ کام کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے لیکن مشفق استاذ اور مہربان بھائی مولانا شبلی کا دباؤ تھا اس لیے مجبوراً راضی ہونا پڑا۔ اس زمانہ میں یہ چیز عام لوگوں کی نگاہوں میں کس قدر فخر و اعزاز کی تھی اور اس سے کتنے دنیوی فوائد حاصل کیے جا سکتے تھے، لیکن علاّمہ فراہی نے حکومت کی خواہش کے باوجود نہ تو اس سے کوئی فائدہ اٹھایا، نہ اس واقعہ کو کبھی اپنے لیے باعث افتخار سمجھا بلکہ اسے وہ اپنی زندگی کا ایک داغ سمجھتے تھے، وہ یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ کوئی شخص ان کے سامنے اس کا کبھی تذکرہ کرے۔

مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں

اس سفر سے واپسی کے بعد علاّمہ فراہی علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، علی گڑھ میں اس وقت مشہور جرمن مستشرق یوسف ہارویز بھی تھے، یوسف ہارویز نے علاّمہ سے عربی کی تکمیل کی، علاّمہ نے ان سے عبرانی زبان سیکھی اور اس میں اتنی صلاحیت پیدا کر لی کہ عبرانی کتابوں سے براہِ راست استفادہ کرنے لگے، پھر بعد میں اپنی قرآنی تحقیقات میں اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔

اسی زمانہ میں سر سیّد مرحوم کو اپنی تفسیر قرآن عربی میں ترجمہ کرانے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کام کے لیے بھی نظر انتخاب علاّمہ فراہی پر پڑی، لیکن جب

علامہ کے سامنے یہ تجویز آئی تو یہ فرماتے ہوئے علامہ نے یہ خواہش رد کردی:

"اس معصیت کی اشاعت میں مَیں کوئی حصّہ لوں، اس کی مجھ سے توقع نہیں رکھنی چاہیے۔"

علامہ کے اس جواب کے بعد پھر کوئی شخص ان کے سامنے یہ تجویز لانے کی جرأت نہ کرسکا بلکہ اس جواب کے بعد غالباً اس تفسیر کے عربی ترجمے کی بات ہی ختم ہوگئی۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں

چند سال علی گڑھ میں قیام کے بعد علامہ فراہی الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، پھر وہیں سے دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی کے لیے علامہ کا انتخاب عمل میں آیا، یہ دارالعلوم اس زمانہ میں حیدرآباد کا سب سے بڑا مردم ساز سرکاری ادارہ تھا، جو ریاست کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کے لیے افراد تیار کرتا تھا۔

حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں علامہ کے ذہن میں ایک ایسی یونیورسٹی کا تخیل آیا جس میں تمام دینی و عصری علوم کی تعلیم اُردو میں دی جائے، اگرچہ اس زمانے میں اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے اتنے امکانات نہ تھے جتنے آج پائے جاتے ہیں، لیکن علامہ نے اپنے ٹھوس دلائل سے ریاست کے تعلیمی بورڈ کو اپنے نظریہ کا قائل بنالیا اور اس کی ایک ایسی اسکیم تیار

کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دی کہ اس کے بعد کسی کو ان کے نظریہ سے اختلاف کرنے کی ہمّت نہ ہُوئی، علاّمہ کا یہی تخیّل تھا جو بالآخر جامعہ عثمانیہ کی شکل میں سامنے آیا۔

حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں نظام نے بار ہا چاہا کہ علاّمہ فراہی ان سے ملاقات کے لیے آئیں، لیکن علاّمہ کبھی اس کے لیے تیار نہ ہُوئے، وہاں کے دوسرے امراء اور نوابوں سے بھی کوئی تعلّق نہ رکھا بس خاص خاص اہلِ علم تھے جن سے علاّمہ کے روابط رہتے، نظام سے ملاقات کے لیے جب مختلف حلقوں سے تحریک ہُوئی تو بالآخر راضی ہو گئے لیکن اس بیزاری کے ساتھ کہ ملاقات کے موقع پر ہی ان سے کہہ دیا "اب مَیں حیدرآباد سے جا رہا ہُوں"۔

نظام نے ہزار چاہا کہ علاّمہ فراہی حیدر آباد ہی میں رہیں، لیکن پھر علاّمہ کسی قیمت پر راضی نہ ہُوئے۔

جو لوگ اس زمانہ کے حیدر آباد اور نظام حیدر آباد سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ نظام سے اس طرح کی ملاقاتیں کتنی بڑی عزّت و کامرانی سمجھی جاتی تھیں، لیکن علاّمہ کی نگاہ میں اس کی جو حیثیت تھی، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب علاّمہ ملاقات کر کے باہر آئے تو سر اکبر حیدری نے پوچھا "کہیے! اعلیٰ حضرت سے کس طرح باتیں ہُوئیں؟"

علاّمہ نے فرمایا: "جس طرح آپ سے ہوتی ہیں"۔

سر اکبر حیدری نے کہا: "آج ہم بے خوبی کا سارا راز سمجھ گئے، جو شخص

طمع نہیں رکھتا، وہ کسی سے کیوں ڈرے؟"

مدرسۃ الاصلاح اور دارالمصنّفین

حیدرآباد سے مستعفی ہونے کے بعد علامہ اپنے وطن آگئے۔ اب ان کو ذرا فرصت ملی کہ مدرسۃ الاصلاح اور دارالمصنّفین کی طرف توجہ کریں جن کے علمی و تعلیمی اور انتظامی امور شروع سے ہی علامہ سے متعلق تھے،

مدرسۃ الاصلاح ضلع اعظم گڑھ میں ایک قدیم عربی درسگاہ ہے: یہ درس گاہ علامہ فراہی اور علامہ شبلی نعمانی کے تعلیمی نظریات پر قائم ہوئی تھی، ادب عربی اور قرآن مجید کی محققانہ تعلیم اس کا خاص نصب العین ہے، علامہ فراہی شروع سے ہی اس کے سرپرست تھے، مگر دوری کی وجہ سے اس کے معاملات میں بہت کم حصّہ لے پاتے تھے؛ حیدرآباد سے قطع تعلّق کے بعد اب براہِ راست وہ مدرسہ کے امور سے دلچسپی لینے لگے۔

۲۵ء سے ۳۰ء تک، جو ان کا سال وفات ہے، برابر وہ مدرسہ کی خدمت میں مصروف رہے، ہفتہ میں ۳ دن شب و روز مدرسہ پر قیام فرماتے، اساتذہ اور منتہی طلبہ کو قرآن پاک کا درس دیتے، منتظمین کو اپنے تعلیمی اور اصلاحی نظریات سے روشناس کراتے، چند ہونہار طلبہ کا انتخاب کر کے ان کی خاص طور سے تربیت فرماتی تاکہ وہ ان کے افکار و نظریات کو اچھی طرح جذب کرلیں اور ان کے بعد ان ہی کے خطوط پر اس تعلیمی اور فکری اصلاح کے مشن کو جاری رکھ سکیں۔ ان منتخب طلبہ میں

مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

وفات

علامہ فراہی کی عام صحت بہت اچھی تھی، وہ شروع سے ورزش کے عادی تھے، اس کا اثر ان کی صحت پر نمایاں تھا، لیکن دو بیماریاں انھیں بُری طرح لگ گئی تھیں، ایک دوران سر، جس کا حملہ عموماً ہوتا رہتا تھا، اور یہ حملہ اتنا شدید ہوتا کہ وہ بالکل بیکار ہو کر رہ جاتے۔

دوسری شکایت پیشاب رک جانے کی تھی، یہ تکلیف انھیں کئی بار ہوئی، آخری مرتبہ جب یہ تکلیف ابھری تو انھیں آپریشن کرانا پڑا، آپریشن کے لیے وہ اپنے ایک ہم وطن ڈاکٹر کے پاس اعظم گڑھ سے متھرا گئے وہاں آپریشن ہوا اور وہ ناکام رہا، بالآخر وہیں ۱۹ ؍ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۱ ؍ نومبر ۱۹۳۰ء کو انتقال فرمایا اور اسی کفرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے، انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور شہداء و صدیقین کے ساتھ انھیں اپنے خاص سایہ میں جگہ دے۔

یوں تو علامہ فراہی فلسفی بھی تھے، متکلم بھی تھے، عربی و فارسی کے بے نظیر ادیب و شاعر بھی تھے، لیکن یہ ساری چیزیں علامہ کے ہاں ضمنی تھیں، اصل چیز جو علامہ کے دل و دماغ اور علم و عمل پر حاوی تھی، وہ قرآن تھا، قرآن

کی ایک ایک آیت، بلکہ ایک ایک لفظ پر انھوں نے اس طرح غور کیا تھا جس طرح اللہ کی کتاب پر غور کرنے کا حق ہے، قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے انھوں نے نہ صرف قرآن پاک کو فکر و نظر کا محور بنایا، بلکہ ان ساری چیزوں کو بھی نہایت تحقیقی نگاہ سے پڑھا جو قدیم و جدید دونوں راستوں سے انھیں مل سکیں اور قرآن فہمی میں کسی حیثیت سے معاون ہو سکتی تھیں، کلام عرب کا ہر شعر جو قرآن کے کسی استعمال کے لیے نظیر بن سکتا تھا، علامہ کی نگاہ میں تھا خطبائے جاہلیت کا ہر خطبہ جو قرآن پاک کی کوئی گرہ کھول سکتا تھا، علامہ کے علم میں تھا، تورات اور تالمود پر وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ عبرانی ذخیروں سے وہ براہِ راست استفادہ کرتے تھے، تاریخ و جغرافیہ کے ان تمام حصوں پر وہ نظر رکھتے تھے جن کا کسی حیثیت سے قرآن پاک سے تعلق تھا۔ حدیث و فقہ کے ذخیروں کو انھوں نے اچھی طرح قرآن کی کسوٹی پر پرکھا تھا، فلسفۂ جدیدہ کی ان تمام شاخوں کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا، جو قرآن کے اجتماعی و سیاسی اور مابعد الطبیعی اصولوں کے سمجھنے میں کام آسکتی تھیں۔

علامہ فراہی نے قرآن پاک پر غور و تدبر کا کام باضابطہ طور پر اس زمانہ سے شروع کیا جب وہ علی گڑھ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب سر سید مغربی نظریات سے مرعوبیت کے نتیجہ میں قرآن کی من مانی تاویلات کر رہے تھے اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو انگریزوں اور انگریزوں کے لائے ہوئے افکار و نظریات سے مرعوب تھا، بری

طرح ان من مانی تاویلات کا شکار ہو رہا تھا، علامہ فراہی نے اس فتنہ کو جہاں انگریزوں کے تسلط کا ایک قدرتی نتیجہ خیال کیا، وہیں انھیں یہ بھی احساس ہوا کہ مذہبی علوم خصوصاً قرآن پاک کی تعلیم و تعلّم کا جو طریقہ مسلمانوں میں رائج رہا ہے وہ بالکل ہی غلط اور فرسودہ ہے اور اسی غلط اور فرسودہ طریقے نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو فکری اعتبار سے اس قدر کمزور اور منفعل بنا دیا ہے کہ بڑی آسانی سے وہ ہر فتنے کا شکار ہو جاتے ہیں اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ قرآن پاک پر غور کرنے کا وہ صحیح طریقہ اختیار کیا جائے جس سے حکمت قرآن کے دروازے کھلیں، تاکہ مسلمان مغرب کی فاسد عقلیت سے مرعوب ہونے کے بجائے قرآن کی صالح عقلیت سے اس کا مقابلہ کر سکیں، چنانچہ علامہ نے تفاسیر کی اندھی تقلید کے بجائے خود قرآن پاک پر براہِ راست غور و تدبر شروع کیا، رفتہ رفتہ قرآن فہمی کے وہ اصول علامہ پر منکشف ہوتے چلے گئے جن کی وضاحت علامہ نے اپنے مقدمۂ تفسیر میں کی ہے۔

علامہ نے تدبر قرآن کا یہ کام طالب علمی کے ہی زمانے میں شروع کیا اور تادم واپسیں اسی کام میں لگے رہے۔

علامہ فراہی ایک عبقری انسان تھے، ذکاوت و ذہانت کا ایک عجیب و غریب نمونہ تھے، پھر ان کے اوقات بہت ہی منضبط رہتے، کسی غیر متعلق یا لایعنی کام میں وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع کرنا پسند نہ فرماتے۔ قرآن پاک پر تدبر و تفکر ہی ان کا سب سے لذیذ مشغلہ تھا، یہی ان کا دن رات کا وظیفہ اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قرآن کے

وہ کون سے پہلو تھے جن پر انھوں نے اپنا یہ پورا وقت صرف کیا، اس رسالہ میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، کتاب کے مطالعہ سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ علامہ فراہی قرآن پاک پر جس حیثیت سے کام کرنا چاہتے تھے، اس کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس کی تکمیل کے لیے ایک نہیں، بہت زندگیاں درکار تھیں، مگر افسوس ہے کہ وہ زندگیاں میسر نہ آسکیں، علامہ فراہیؒ کے بعد اس کام کو آگے بڑھانا تو درکنار، جتنا کچھ علامہ خود کر گئے تھے، اس کو بھی لوگوں کے درمیان متعارف نہ کرایا جاسکا، آج علامہ کی وفات کو تقریباً نصف صدی ہو گئی مگر ان کے تمام مسودات بھی منظر عام پر نہ آسکے۔

اس دور میں جب کہ شعراء اور فلاسفہ کے ایک ایک شعر اور ایک ایک جملے پر کتابیں لکھی جارہی ہیں ان کے علمی و ادبی کارناموں پر ریسرچ کے لیے باقاعدہ انجمنیں اور اکیڈمیاں قائم کی جارہی ہیں، ایک ایسے ترقی یافتہ دور میں علامہ فراہی کے جانشینوں کی سرد مہری دیکھو کہ انھیں علامہ کی اصل کتابیں تک شائع کرنے کا ہوش نہیں ہے، انھیں ایڈٹ کرنا، ان کی توضیح و تشریح کرنا، ناتمام مسوّدوں کی تکمیل کرنا، علمی دنیا میں انھیں متعارف کرانا تو بہت دور کی بات ہے۔

ضرورت ہے کہ کچھ حوصلہ منداہلِ علم اس عظیم کام کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور علامہ کے بنائے ہوئے خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں، کہ یہ کتاب الٰہی کی بڑی زبردست خدمت ہوگی،

وہ علامہ کی ایک ایک سطر کو پڑھیں، ان کے دریافت کردہ اصولوں کو پرکھیں، قرآن فہمی کے سلسلہ میں ان کا تجربہ کرکے دیکھیں، علامہ کی جو قرآنی تحقیقات ہیں، انھیں اپنے نقد و نظر کا نشانہ بنائیں، علم و تحقیق کی میزان میں اُنھیں تولیں، اگر وہ ان اصولوں سے مطمئن ہوں، جن لکیروں پر علامہ فراہی کام کرنا چاہتے تھے، ان کے اندر وہ خیر و برکت اور افادیت محسوس کرتے ہوں، تو پورے عزم و جزم کے ساتھ آگے بڑھیں، ان اصولوں اور ان لکیروں کو خود بھی اپنائیں، دوسروں کے درمیان بھی ان کی اشاعت کریں، ان کی روشنی میں اس کام کو اور ترقی دیں، سہل انگاری یا فرسودہ طریقوں کی بے جا پاسداری میں اس عظیم تجدیدی کارنامے کو نظر انداز نہ کریں، کہ علمی حیثیت سے یہ ایک زبردست خیانت ہوگی، ملت پر بڑا ظلم ہوگا، کتاب الٰہی کی کھلی ہوئی حق تلفی ہوگی۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جب علامہ فراہی کی ان قرآنی لکیروں اور تفسیری اصولوں پر گفتگو ہوتی ہے تو ہر ایک اُن کی عظمت اور قدر و منزلت کا اعتراف کرتا ہے، مگر جب انھیں عملاً برتنے اور ان کی ترویج و اشاعت کے لیے جدّوجہد کرنے کی بات آتی ہے تو کسی کے قدم آگے نہیں بڑھتے ؎

فریب خوردۂ منزل ہے کارواں ورنہ
زیادہ راحت منزل سے ہے نشاطِ رحیل

بلاشبہ یہ راستہ لمبا بھی ہے اور دشوار بھی، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس راستے کو اپنائے بغیر منزل تک پہنچنا ممکن نہیں،

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ

محمد عنایت اللہ

۲۰ محرم الحرام ۱۳۹۸ھ

"مولانا حمید الدین مرحوم، جن کی عبارت پر یہ ہنگامہ بپا کیا گیا ہے، ان علماءِ حق میں سے تھے، جن کا سرمایۂ امتیاز صرف علم ہی نہیں ہوتا، بلکہ عمل بھی ہوتا ہے، اور اس دوسری جنس کی کمیابی کا جو عالم ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے، مَیں جب کبھی ان سے ملا، مجھ پر ان کے علم سے زیادہ ان کی عملی پاکی کا اثر ہُوا، وہ پُورے معنوں میں ایک متقی اور راست باز انسان تھے، ان کے دل کی پاکی اور نفس کی طہارت دیکھ کر رشک ہوتا تھا۔"

امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ

علّامہ حمید الدّین فراہیؒ

اور ان کا

تجدیدی کارنامہ

ایک طالب قرآن جب قرآن پاک کا مطالعہ کرتا ہے، تو اس کے ذہن میں مختلف قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں، مثلاً:

پہلا سوال

اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ وہ لوگ جو اس کتاب پر ایمان نہیں لاتے اور اس کے مقابلہ میں انکار و اعراض اور سرکشی کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں، ان سے کہہ دو کہ اگر جن و انس سب مل کر بھی ایسا قرآن تیار کرنا چاہیں تو وہ قیامت تک اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ اس میں وہ اپنی تمام قوتیں اور ساری ذہانتیں صرف کر ڈالیں۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا: "اے نبی! کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن تم نے خود گھڑ لیا ہے، اگر ایسا ہے تو ان سے کہو کہ یہ لوگ بھی ایسی ہی دس سورتیں گھڑ کر پیش کر دیں" —— پھر دوسری جگہ فرمایا: "ہم نے اپنے بندے پر جو قرآن نازل کیا ہے اگر اس میں تمھیں کچھ شک ہے، تو اسی جیسی ایک سورہ تم لا کر پیش کر دو، اور صرف تم ہی نہیں، اپنے سارے خداؤں کو بلا لو اور تم سب مل کر آخری کوششیں کر ڈالو، دیکھو اس میں کامیابی ہوتی ہے؟" —— پھر وہیں یہ بھی فرما دیا کہ "تم کبھی اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

یہ آیتیں جب سامنے آتی ہیں تو فطری طور پر ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اہلِ عرب جو فصاحت و بلاغت کے امام تھے، جو اپنی زبان آوری اور طلاقت لسانی میں ضرب المثل تھے، جن کے درمیان ایسے ایسے قادر الکلام شعراء موجود تھے کہ وہ بادشاہوں کے درباروں میں یا مفاخرت کی مجلسوں میں برجستہ نہایت لمبے لمبے قصیدے کہہ ڈالتے تھے، جن کا ایک ایک شعر اپنی جگہ پر فصاحت و بلاغت کا ایک نادر نمونہ ہوتا تھا، ان کے درمیان ایسے ایسے جادو بیان اور ماہر زبان مقررین موجود تھے کہ جب وہ بولنے پر آتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ خوبصورت جملوں اور دلکش محاوروں کا بحرِ او قیانوس ہے جو ٹھاٹھیں مارتا چلا آرہا ہے، ایک ایسی قوم جو اتنی بے پناہ ذہانت کی مالک تھی اور زبان و بیان پر ایسی غیر معمولی قدرت رکھتی تھی وہ باوجود اپنی ساری نخوت و حمیت کے قرآن پاک کے چیلنج کو سنتی اور اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے، وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کی ہمت نہیں کرتی نہ صرف یہ کہ اس چیلنج کو قبول کرنے کی ہمت نہیں کرتی بلکہ عملاً اپنے عجز کا اعتراف کرتی اور اس کے اعجاز بیان پر سر دھنتی ہے، لبید بن ربیعہ عامری عرب جاہلیت کے معروف شاعر تھے، اصحاب معلقات میں ان کا بھی شمار ہے بلکہ بعض پہلوؤں سے ان کا معلقہ دوسرے تمام معلقات پر فوقیت رکھتا ہے۔ ان کے بارے میں تاریخوں میں آتا ہے کہ جب ان کے کان میں قرآن پاک کی چند آیتیں پڑیں تو وہ شوق و محبت کی بے تابیوں کے ساتھ دربارِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے، قرآن پاک

کے حسن وجمال، بلاغت کلام اور اعجاز بیان سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے شاعری ترک کر دی اور پورا قرآن پاک حفظ کر لیا۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد بھی وہ کئی سال با حیات رہے، مگر اس پوری مدتِ حیات میں صرف ایک شعر کہا، جس میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انھیں دولتِ اسلام سے مالا مال کیا، اس نعمت کے عطا کرنے سے پہلے انھیں اٹھا نہیں لیا، شعر یوں ہے :ے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اِذْ لَمْ یَاْتِنِیْ اَجَلِیْ[1]
حَتّٰی لَبِسْتُ مِنَ الْاِسْلَامِ سِرْبَالًا

حضرت عمرؓ کا قصہ بھی یہاں قابلِ ذکر ہے، حضرت عمرؓ اپنے اسلام لانے کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"پہلے مجھے اسلام سے بڑا بُعد تھا، مَیں دورِ جاہلیت میں ایک شرابی آدمی تھا، مجھے شراب پینے کی بڑی لت تھی، ہماری ایک مجلس بھی تھی جہاں قریش کے کچھ لوگ اکٹھا ہوا کرتے تھے..... مَیں ایک دن اپنے ندیموں کی تلاش میں نکلا، مگر ان میں سے کوئی نہ مِلا، مَیں نے سوچا، فلاں مے فروش کے ہاں چلوں،..... مَیں اس کے ہاں گیا، مگر اُسے بھی نہیں پایا، پھر سوچا، خانہ کعبہ کی طرف چلوں، اس کا سات یا ستر

---

[1] ترجمہ: خدا کا شکر ہے کہ میری موت نہیں آئی، یہاں تک کہ اسلام کی پوشاک مَیں نے زیبِ تن کر لی۔

طواف کر لوں ..... ! چنانچہ طواف کعبہ کی غرض سے میں مسجد حرام آیا، وہاں دیکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں، آپ جب نماز پڑھتے تو شام کی طرف رُخ کرتے اور کعبہ شریف کو اپنے اور شام کے درمیان کر لیتے، نماز کی جگہ رکن اسود اور رکن یمانی کے درمیان ہوتی، میں نے آپ کو دیکھا تو سوچا، بخدا کتنا اچھا ہو اگر آج رات میں محمدؐ کی آواز پر کان لگاؤں، سنوں وہ کیا کہتے ہیں، مجھے یہ بھی خیال ہُوا، اگر میں قریب گیا تو آپ کا ذہن پراگندہ ہو جائے گا، چنانچہ میں حجر کی طرف سے آیا اور غلاف کعبہ کے اندر چھپ گیا میرے اور آپ کے درمیان صرف غلاف کعبہ حائل تھا، میں نے جب قرآن سنا تو میرا دل موم ہو گیا، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اسلام میرے دِل میں سرایت کر گیا۔"

رفلمّا سمعت القرآن رقّ له قلبی، فبکیتُ ودخلنی الإسلامُ۔ [1]

ایک دوسری روایت ہے:

"حضرت عمرؓ تلوار حائل کیے ہُوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی طرف چلے، یہ لوگ کوہ صفا کے قریب ایک

---

[1] التصویر الفنی فی القرآن (ص: ۱۱، ۱۲)

گھر میں جمع تھے، زن و مرد کل چالیس جاں نثار تھے، راستہ میں نعیم بن عبداللہ سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے پوچھا: کہاں کا قصد ہے؟ عمرؓ نے اپنا ارادہ بتایا، اُنھوں نے کہا: عافیت اسی میں ہے کہ آلِ مناف سے تعرض نہ کرو اور پہلے اپنے سالے اور بہن کی تو خبر لو، وہ دونوں بھی اپنے آبائی دین سے بےزار ہو گئے ہیں۔۔۔ عمر اُن دونوں کے ہاں گئے، وہاں دیکھا حضرت خبابؓ ان دونوں کو قرآن سنا رہے ہیں، عمر اندر گھس گئے، اپنے سالے سعید بن زید کو مارا پیٹا اور بہن فاطمہ کو لہولہان کر دیا، پھر کچھ گفتگو کے بعد صحیفہ ہاتھ میں لیا تو اس میں سورۃ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی، اس کا کچھ حصہ دیکھا تو زبان سے نکلا:

یہ کلام کتنا دلآویز اور کس قدر بلند و اشرف ہے، (ما احسن هٰذَا الكلام و اكرم) پھر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور اپنے اسلام کا اعلان کیا۔

اس واقعہ سے متعلق اور بھی روایتیں آتی ہیں، مگر ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآن کا کچھ حصہ پڑھا یا سنا، قرآن نے ان پر جادو کا سا اثر کیا اور انھیں لاکر اسلام کے آگے جھکا دیا۔

ولید بن مغیرہ کا واقعہ بھی یہاں قابل ذکر ہے:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، وہیں قریب ہی ولید بن مغیرہ بھی تھا، جو آپ کی قراءت سن رہا

تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو محسوس ہو گیا وہ بڑے غور سے آپ کی قرأت سُن رہا ہے، وہ آیتیں آپ نے پھر دہرا دیں، ولید وہ آیتیں سننے کے بعد اپنی قوم بنی مخزوم کی مجلس میں آیا، اس نے کہا:

"ابھی مَیں نے محمدؐ کا کلام سنا، بخدا نہ وہ انسانوں کا کلام ہے، نہ جنوں کا، بخدا اس میں بڑی شیرینی ہے، بڑی رعنائی و دلآویزی ہے، وہ ایک ایسا درخت ہے جو پھلوں سے لدا ہُوا ہے، وہ ایک ایسا چشمہ ہے جو شیریں پانی سے ابل رہا ہے، بخدا یہ کلام اونچا ہو کے رہے گا، اسے نیچا نہیں کیا جا سکتا، وہ سربلند ہو کے رہے گا، اسے سرنگوں نہیں کیا جا سکتا۔

روالله لقد سمعت من محمد آنفا کلامًا ما هو من کلام الانس و لا من کلام الجن، والله إنّ له لحلاوة وإنّ علیه لطلاوة، وانّ اعلاه بمثمر وان اسفله لمغدق وإنه یعلو وما یُعلیٰ[1]

یہ ایک نہایت کٹر دشمن کے تاثرات ہیں، جو قرآن کے سلسلہ میں بے اختیار اس کی زبان سے ادا ہو گئے ہیں۔

روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ مکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم رات میں قیام کرتے، بحالت نماز میں قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تو سرداران قریش

---

[1] التصویر الفنی فی القرآن (سیّد قطب) ص: ۱۳

باوجود اپنی ساری نفرتوں اور عداوتوں کے بالعموم قریب ہی چھپ چھپا کر بیٹھ رہتے کلامِ الٰہی کی لذت وحلاوت سے محظوظ ہوتے اور صبح ہونے سے پہلے اندھیرے منہ پاؤں دبا کر اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتے، پھر دن نکلنے پر اسی کی مخالفت کے لیے ترکش سنبھال لیتے، سوال پیدا ہوتا ہے آخر قرآن پاک کے اندر اعجاز بیان اور بلاغت کلام کا وہ کون سا پہلو ہے جو سرکش سے سرکش دشمنوں کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے، وہ اپنی ساری نخوتوں اور حمیتوں کے باوجود اس کا لوہا مان لیتے ہیں، جب کہ بادی النظر میں اس کے اندر کوئی ایسی خصوصیت نظر نہیں آتی، عوام تو خیر عوام ہیں، خواص بھی اس کے اندر اس طرح کا کوئی پہلو دریافت کرنے اور اس کی نشاندہی کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ قرآن پاک سے محبت وعقیدت کی وجہ سے وہ زبان سے ایسی بات کہنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

دوسرا سوال

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مخالفتوں کے ہجوم اور آزمائشوں کے طوفان میں اگر کوئی چیز مومنین کی ڈھارس بندھاتی تو وہ یہی قرآن پاک کی آیتیں تھیں، انھی آیات سے مسلمانوں کو غذا حاصل ہوتی، یہی آیتیں ان کے زخم پر مرہم کا کام کرتیں، انھی سے ان کی تسلی اور دلبستگی ہوتی، جب انھیں مظالم کا زہر آب پلایا جاتا، تو وہ انھی آیتوں سے زندگی اور توانائی حاصل

کرتے، یہ وہ آبِ حیات تھا جس کے چند جام پی کر وہ جوش و ولولہ سے سرشار ہو جاتے اور پھر آندھیوں اور زلزلوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے، ان پر مصائب کے پہاڑ توڑے جاتے، لرزہ خیز مظالم کے وہ نشانہ بنائے جاتے، مگر جُوں ہی وحیِ الٰہی آتی اور قرآن پاک کی چند آیتیں ان کے کانوں میں گونجتیں، وہ سارا دکھ درد بھول جاتے، وہ اس طرح کھل اٹھتے جیسے کوئی سوکھتی ہُوئی کھیتی ہو جو بارش کی چند چھینٹیں پڑتے ہی لہلہا اُٹھے، یا کوئی خزاں نصیب چمن ہو جو بہار کا چہرہ دیکھتے ہی مسکرانے لگے، یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین وحیِ الٰہی کا شدت سے انتظار کرتے اور اس میں کچھ تاخیر ہوتی تو آپ بے قرار ہو جاتے، نہ صرف بے قرار ہوتے، بلکہ حضرت جبرئیلؑ وحی لے کر آتے تو آپ ان سے تاخیر کا شکوہ کرتے، حضرت جبرئیلؑ آپ کو تسلی دیتے اور فرماتے:

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (مریم: ۶۴، ۶۵)

اور ہم نہیں اُترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے، ہمارے آگے اور پیچھے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب اسی کے اختیار میں ہے اور آپ کا رب کسی کو بھولنے والا نہیں، آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے۔ سب کا وہ رب ہے۔

تو اسی کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پر جمے رہو کیا تمھارے علم میں اس جیسا کوئی ہے۔

اسی طرح روایات میں آتا ہے کہ حضرت جبرئیل وحی لے کر آتے تو آپ شوق ورغبت کی بے تابیوں کے ساتھ وحی کے کلمات جلدی جلدی زبان مبارک سے دہرانے لگتے، آپ اس بات کے آرزومند ہوتے کہ زیادہ سے زیادہ آیتیں نازل ہو جائیں، تاکہ آپ کو وہ نعمت جلد حاصل ہو جائے جس سے آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک وابستہ ہے، اور آپ کو انتظار کی بے قراریوں سے راحت مل جاتے، گویا آب حیات کے چند جام آپ کی تسکین کے لیے بس نہ کرتے بلکہ آپ آرزومند ہوتے کہ پورا چشمۂ حیواں آپ پر انڈیل دیا جائے، آپ کا یہ شوق وحی بلاشبہ بہت ہی قابلِ قدر تھا، مگر آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کی جاسکتی تھی، اس لیے کہ یہ حکمتِ الٰہی کے منافی تھی، اسی لیے لسان غیب نے بار بار اس پر تنبیہ کی اور آپ کو صبر سے کام لینے کی تاکید کی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؀

(سورۃ القیامۃ: ۱۶-۱۹)

تم اس کے ساتھ اپنی زبان کو جنبش نہ دو، اس آرزو میں کہ اُسے جلد پا جاؤ، بلاشبہ ہمارے ذمّہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا، پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کرو، پھر ہمارے ذمّہ ہے اس کی وضاحت۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ
رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۝ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ
نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝ (سورۃ طٰہٰ: ۱۱۴، ۱۱۵)

اور قرآن کے معاملہ میں وحی تمام ہونے سے پہلے جلدی نہ مچاؤ، اور دُعا کرو کہ اے میرے رب! میرے علم میں ترقی دے، اور ہم نے آدم کو اس سے پہلے ایک عہد کا پابند کیا تھا، تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس کے اندر ارادے کی پختگی نہیں پائی۔

صحابہ کرام کو قرآن پاک سے کتنا شغف تھا، اور ان کے اندر فہم قرآن کا کتنا شوق تھا، اس کا اندازہ اس روایت سے لگایا جاسکتا ہے:

ابوعبدالرحمٰن اسلمی کہتے ہیں، مجھ سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن پاک پڑھتے اور پڑھاتے تھے، مثلاً عثمان بن عفان اور عبداللہ بن مسعود وغیرہ، ان لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں بھی پڑھ لیتے تو جب تک ان آیات کے تمام علم وعمل کو اپنے اندر جذب نہ کر لیتے، آگے قدم نہ بڑھاتے اُنھوں نے کہا، ہم نے قرآن کے علم وعمل دونوں کو ایک ساتھ حاصل کیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ایک ایک سورہ کو سمجھنے اور محفوظ کرنے میں وہ برسوں لگادیتے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ سورہ بقرہ پر بارہ سال تک غور فرماتے رہے خود قرآن پاک نہایت واضح لفظوں میں ان لوگوں کی آیاتِ الٰہی سے وابستگی کی شہادت دیتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

يَتْلُوْنَ اٰيَاتِ اللّٰهِ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ۔ (آل عمران: ۱۱۳)

وہ رات کے اوقات میں آیات الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں اور وہ سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

ایک طالب قرآن جب ان آیتوں اور روایتوں کو دیکھتا ہے، جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم قرآن پاک کے لیے کتنے پیاسے رہتے تھے اور صحابہ اسے کس طرح گلے کا تعویذ بنائے رہتے تھے ایک ایک سورہ کے مطالعہ میں وہ برسوں لگے رہتے تھے، تو اسے سخت حیرت ہوتی ہے، اسے حیرت ہوتی ہے کہ یہی قرآن پاک جسے ہم نہ چھوئیں تو کوئی بیقراری نہیں ہوتی اور پڑھیں تو کوئی لذّت نہیں ملتی، جو بالکل ایک سادہ سی کتاب معلوم ہوتی ہے، آخر اس کے اندر انھیں نعمتوں اور لذّتوں کی کون سی جنّت نظر آتی تھی، جس کی سیر کرنے، جس کے پھولوں سے مشامِ جاں کو معطر کرنے اور جس کے پھلوں سے قلب و رُوح کی غذا حاصل کرنے کے لیے وہ بے چین رہا کرتے تھے: آخر یہ کیا ہے کہ ہم اس گھاٹ پر پیاسے آتے اور پیاسے لوٹ جاتے ہیں، مگر وہی اس گھاٹ سے بادۂ کوثر کے جام بھرتے اور انھیں پی پی کر جوش ایمان اور ولولۂ عمل سے سرشار ہو جاتے، یہ تو نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم اور مخلص اہلِ ایمان کی کیفیّت تھی، ان کے علاوہ وہ صالح اور سلیم الفطرت روحیں جن کا تعلق اہلِ کتاب سے تھا، وہ قرآن پاک کے لیے کتنی پیاسی تھیں اور قرآنی آیات کو سُن کر ان کے قلب و رُوح کی کیا کیفیّت ہوئی، اس کی تفصیل مندرجہ ذیل آیات میں ملاحظہ فرمائیں:

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا، وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا۩ (بنی اسرائیل: ۱۰۷، ۱۰۹)

ان سے کہو، تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، وہ لوگ جنھیں اس سے پہلے سے علم مِلا ہُوا ہے، جب یہ ان کو سُنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں، اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب بلاشبہ ہمارے رب کے وعدے کو پورا ہونا ہی تھا، اور وہ ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے گرتے ہیں، اور یہ ان کے خشوع میں اضافہ کرتا ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى، ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ، وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ، یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَ نَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (المائدہ: ۸۲، ۸۴)

تم اہلِ ایمان کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو

پاؤگے اور اہلِ ایمان کے لیے الفت ومحبت میں سب سے زیادہ قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے، جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ ان کے اندر علماء درمیان ہیں اور وہ استکبار نہیں کرتے اور یہ جب سنتے ہیں اس قرآن کو جو رسولؐ کی طرف اُتارا گیا تو تم دیکھتے ہو کہ معرفت حق کی خوشی میں ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ابل پڑتی ہیں، وہ پکار اُٹھتے ہیں، اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، تو ہمیں گواہوں میں لکھ لے، اور بھلا ہم اللہ پر ایمان کیوں نہ لائیں، ہمارے پاس جو حق آیا ہے اسے قبول کیوں نہ کریں، جب کہ ہم اس بات کے آرزومند ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیکوکاروں کے زمرے میں شامل کرے۔

ان سلیم الفطرت روحوں نے جس والہانہ انداز میں کتاب الٰہی کا خیر مقدم کیا ہے اور جس جوش وخروش کے ساتھ اس پر ایمان لائی ہیں، یہ اس کی ایک تصویر ہے، ان حق پرستوں کی کیفیت یہ تھی کہ جب وہ قرآن پاک کی آیتیں سنتے اور ان کے اندر اس حق کی کرنیں جلوہ گر دیکھتے، جس کے انتظار میں انھوں نے بیقراری کی طویل راتیں کاٹی تھیں، تو فرطِ مسرت سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے اُبل پڑتیں، وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے اور بے اختیار ان کی زبانیں پکار اُٹھتیں: اے ہمارے رب! ہم اس کتاب پر اور اس کے لانے والے پر ایمان لائے، تو ہمیں اس کے گواہوں میں لکھ لے۔

یہاں ایک طالب قرآن کے ذہن میں لازماً یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر اس قرآن کو پاکر ان کی یہ کیفیت کیوں ہوتی تھی؟ جن آیتوں کو سُن کر ہم پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے، انہی آیتوں کے اندر وہ کون سی بجلیاں نظر آتی تھیں جو انھیں اس قدر بے تاب کر دیتی تھیں؟ جس قرآن کو پڑھ کر یا سُن کر ہمیں ذرا بھی نشاط اور انبساط نہیں محسوس ہوتا، اسی قرآن کو سُن کر ان کی آنکھوں میں خوشی و مسرت کے آنسو کیوں کر چمکنے لگتے تھے؟ کلامِ الٰہی کے اندر انھیں "روح افزا" کی وہ کون سی بوتلیں نظر آتی تھیں، جو ہمیں نظر نہیں آتیں؟ آیاتِ الٰہی کے دریچوں سے انھیں انوار و تجلیات کی کیسی بہاریں نظر آتی تھیں کہ ان کی ایک بھی جھلک دیکھنے سے ہماری آنکھیں عاجز رہ جاتی ہیں، آج کوئی بھی طالب علم قرآن پاک کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے یہ سوالات پریشان کرتے ہیں، مگر ان سوالات کے تشفی بخش جوابات اسے کہیں نہیں مل پاتے۔

تیسرا سوال

ایک طالب قرآن تاریخ اسلام کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ ماضی میں اسی قرآن پاک نے اس دنیا میں ایک نہایت عظیم انقلاب برپا کر دیا تھا، ایسا زبردست انقلاب کہ تاریخ عالم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، انتہائی قلیل مدت میں اس نے عرب کے شتربانوں کو جہاں بانوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا، حجاز کے صحرانشینوں کو بزمِ عالم کا صدر نشین بنا

دیا تھا، جو لوگ اس کتاب پر ایمان لائے تھے انھیں عزت و اقبال کی ساری کامرانیاں اس نے عطا کیں، مگر جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی، ان کی عزت و اقتدار کے پرزے اڑ گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پورے طور پر صادق آیا:

اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ قَوْمًا وَّ یَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ ایک قوم کو عزت و رفعت عطا کرے گا اور ان کے علاوہ دوسروں کو ذلت کی پستی میں ڈال دے گا۔

اس کتاب کی بدولت مسلمانوں نے اس زمین پر ایسی شاندار تہذیب قائم کی، کہ ویسی کامل اور دلکش تہذیب تاریخ عالم نے کبھی دیکھی نہیں۔ ایک طالب قرآن ایک طرف قرآن پاک کا مطالعہ کرتا ہے اور دوسری طرف اس کے ان حیرت انگیز انقلابی کارناموں کا، تو اسے سخت حیرت ہوتی ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس چھوٹی سی کتاب کے اندر وہ کون سی بجلیاں پوشیدہ ہیں جنھوں نے اس طرح دیکھتے دیکھتے باطل کے خرمن کو خاکستر کر دیا، اس کی آیتوں میں وہ کون سی بے پناہ قوت تسخیر ہے کہ اس نے نہایت جمی جمائی اور مستحکم شہنشاہیتوں کو اکھاڑ کر رکھ دیا۔ اور انھوں نے اس کے آگے جھک جانے میں ہی اپنے لیے عافیت سمجھی، یہ ایک سوال ہے جو ایک طالب قرآن کے ذہن میں ابھرتا ہے، مگر اسے کہیں اس کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔

یہ کتاب جو آج ہمیں چند اخلاقی پند و نصائح، چند معاشرتی احکام، چند فقہی قوانین، چند معتقدات و اعمال اور چند تاریخی واقعات کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے، اسی چھوٹی سی کتاب نے عرب کے امی اور ناخواندہ لوگوں کو علم و حکمت کے موتیوں سے مالا مال کر دیا تھا، انھیں اس بحر کا شناور اور اس میدان کا شہسوار بنا دیا تھا، ان کے پاس جو کچھ تھا، بس یہی قرآن تھا، مگر اسی قرآن سے اُنھوں نے وہ سب کچھ سیکھ لیا تھا جو ایک اُبھرتی ہُوئی ترقی پذیر قوم کے لیے درکار تھا، انھیں اپنی اس زبردست اور انقلابی جدّ و جُہد کے کسی مرحلہ میں اپنی بے مائگی اور علمی پس ماندگی کا احساس نہیں ہُوا، اُنھوں نے کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ ترقی کے اصول اور فرمانروائی کے رموز دوسروں سے سیکھیں، اس کے برعکس ایک وقت آیا کہ وہ اقوام عالم کے معلم و مربی بن گئے، اور ان کی ذات سے ایک عام علمی بیداری پیدا ہوگئی، انھیں قرآن پاک سے جو نورِ حکمت حاصل ہُوا تھا، اس کی روشنی میں انھوں نے علم و فن کے گیسو سنوارے، علم و تحقیق کے نئے اصول دیے، علم و معرفت کی نئی دنیاؤں کی سیر کرائی، انسانیت کو ایک بالکل ہی نئی اور نہایت ترقی یافتہ تہذیب سے روشناس کرایا، یُوں کہو کہ ان کے دم سے چمنستانِ علم میں بہار آگئی اور جہالت کی خزاں روپوش ہوگئی، ایک طالب قرآن جب ان تاریخی حقائق کو سنتا ہے اور اسی تاثر کے ساتھ وہ قرآن پاک پر نگاہ ڈالتا ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے، وہ ان تاریخی حقائق کا راز قرآن پاک کے اندر ڈھونڈنا چاہتا ہے، مگر وہ اپنی کوشش میں ناکام

رہتا ہے، اس پر قرآن کے اندر ان زبردست انقلابات کا کوئی راز نہیں کھُلتا۔

قرآن پاک سے متعلق یہ چند نہایت اہم اور بنیادی سوالات ہیں جو ہر ہوشمند طالب علم کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہونے ناگزیر ہیں، سوال یہ ہے کہ ان اشکالات اور ان الجھنوں کا تشفی بخش جواب کیا ہے، اور وہ ہمیں کہاں مل سکتا ہے ؟

تفاسیر کا حال

ظاہر ہے اس سلسلہ میں مکمل رہنمائی ہمیں قرآن پاک کی تفاسیر سے ملنی چاہیے، قرآن پاک سے متعلق یہ یا اس قسم کے جتنے بھی شکوک یا الجھنیں ذہنوں میں پیدا ہوں ان کا واضح جواب اور ان کے سلسلہ میں پوری روشنی ہمیں انہی تفاسیر سے ملنی چاہیے، مگر عام طور سے تفاسیر کا جو حال ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں، یہ تفاسیر ایک طالب قرآن کی ذہنی الجھنوں کو ختم نہیں کرتیں، یہ تفاسیر قرآن کا بہت ہی محدود تصور پیش کرتی ہیں، یہ لغات کو حل کرنے، نحوی تراکیب کو سمجھنے اور آیات کے سرسری مفہوم تک پہنچنے میں تو کچھ معاون ہوتی ہیں اس سے آگے ان سے کچھ مزید حاصل کرنا چاہیں تو اس میں ناکامی ہوتی ہے، یہ کتاب الٰہی کے اسرار و حکم اور اس کے رموز و معارف کی طرف رہنمائی نہیں کرتیں، قرآن پاک جو سرتاسر اک جلوۂ حسن و جمال ہے، اس کے حسن کے کسی ایک گوشے کو بھی یہ بے نقاب نہیں کرتیں، قرآن پاک

کے اندر کیا امتیاز اور کیا اعجاز ہے اس کی آیات کے اندر کیا سحر ہے کہ اس نے دلوں کو مفتوح اور ذہنوں کو مسحور کر لیا، اس مسئلہ سے وہ بحث ہی نہیں کرتیں اور اگر کہیں کرتی ہیں تو بہت ہی سرسری انداز میں، یہ قرآن پاک کی بالکل اسی طرح تفسیر کرتی ہیں جس طرح کافیہ اور ہدایہ کی شرحیں لکھی گئی ہیں، ایک طالب قرآن کے ذہن میں قرآن پاک سے متعلق جو مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن کی طرف پیچھے ہم نے اشارہ کیا ہے، ان میں سے کسی ایک سوال کا بھی یہ تشفی بخش جواب فراہم نہیں کرتیں، اس کے برعکس وہ اس کتاب حکیم کی حکیمانہ نظم و ترتیب کے سارے تار و پود بکھیر دیتی ہیں، یہ آیتوں کے باہمی ربط و نظام کو بالکل ہی درہم برہم کر دیتی ہیں، یہ کلام الٰہی کو ایک بالکل ہی منتشر اور غیر مربوط کلام فرض کر کے ہاتھ میں لیتی ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کلام عموماً اپنی اصل سمت سے ہٹ جاتا ہے، یہ لبسا اوقات آیتوں کی ایسی تفسیریں کرتی ہیں، جن تفسیروں کی آیتیں متحمل ہو ہی نہیں سکتیں، یہ جگہ جگہ وحی الٰہی کو ایسے معنی پہناتی ہیں جس معنی کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہوتی پھر چونکہ یہ اس کتاب حکیم کے حسن نظام اور جودت ترتیب کی قائل نہیں، اس لیے نظم قرآن کے پردے میں اللہ تعالیٰ نے علوم و معارف کے جو گنجینے رکھ دیے ہیں، ان کی طرف ان کی نظر ہی نہیں جاتی۔

قرآن سے عام بے رغبتی

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ امت علوم قرآن کے ایک وافر حصہ سے ہاتھ دھو

بیٹھی، پھر جب علوم قرآن کا بیشتر حصّہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا، تو رفتہ رفتہ اس سے ہماری رغبت اور وابستگی بھی کم ہوتی گئی، قرآن پاک کی عظمت و بلندی اور اس کے اعجاز کا جو تصوّر ہمارے ذہنوں میں تھا، دھیرے دھیرے وہ تصور رخصت ہو گیا وہ قرآن پاک جو کبھی علوم و معارف کا ایک بحرِ بیکراں سمجھا جاتا تھا، وہ ایک جوئے کم آب بن کر رہ گیا، اور علمی حیثیت سے ہمارے اندر اس کا کوئی مقام نہیں رہ گیا، ہم اس کی بلند سطح سے اتنے نیچے آگئے کہ اب اس کی قدر و قیمت کو سمجھنا اور اس کی عظمت و اعجاز کا ادراک کرنا ہمارے بس سے باہر ہو گیا، چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ عقیدت و محبت کے سارے اعترافات کے باوجود ہم اسے اپنے یہاں عملاً وہ رتبہ و مقام نہ دے سکے اور نہ دینے کے لیے تیار ہیں جس کا وہ صحیح معنوں میں مستحق ہے۔

دینی درسگاہوں میں قرآن کی کس مپرسی

یہ ہماری بے شمار دینی درسگاہیں ہیں، جہاں نظری اور دستوری حیثیت سے تعلیم قرآن کو اوّلیت حاصل ہے، جو اسی نام پر ہی قائم ہوئی تھیں کہ وہاں قرآن پاک کے چرچے ہوں گے، انھیں قرآنی معارف کی اشاعت کا مرکز بنایا جائے گا، مگر عملاً وہاں اوّل روز سے قرآن سب سے زیادہ مظلوم رہا، وہاں نہ صرف یہ کہ اسے کوئی امتیازی مقام نہیں دیا گیا، بلکہ اسے وہ حیثیت بھی نہیں دی گئی، جو دوسری چیزوں کو دی گئی، ہماری جتنی بڑی درسگاہیں ہیں، ان کا ایک طرف سے جائزہ لے کر دیکھ لو، کیا وہاں قرآن کی بھی وہی

ہما بھی ہے، جو صحاح ستہ، ہدایہ، شرح وقایہ، مقامات حریری اور دیوان متنبی وغیرہ کی ہے، کیا ان کتابوں کو جتنا وقت دیا جاتا ہے اور ان کے لیے جتنا اہتمام کیا جاتا ہے، قرآن پاک کا بھی اتنا ہی اہتمام کیا جاتا ہے، قرآن پاک بیچارہ تو اتنا ستم رسیدہ ہے کہ وہاں اس کے حصے کا جو تھوڑا بہت وقت ہوتا ہے، وہ بھی اس کو نہیں ملتا، بلکہ اس کے نام پر دوسروں کو مل جاتا ہے، وہاں قرآن پاک کے گھنٹے میں قرآن پاک کی تعلیم نہیں ہوتی، بلکہ جلالین شریف اور بیضاوی شریف کی خواندگی ہوتی ہے، کچھ دوسرے مدارس ہیں، جہاں یہ کیفیت تو نہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے ان کا حال بھی کچھ اچھا نہیں، وہاں گو یہ ستم نہیں ہوتا کہ قرآن کے نام پر دوسری کتابیں پڑھائی جائیں، وہاں قرآن پاک کے گھنٹے میں قرآن پاک ہی پڑھایا جاتا ہے، مگر تعلیمی اوقات میں سے اس کا حق بھی بس اتنا ہی ہوتا ہے جتنا دوسرے فنون کا، جس طرح ایک ایک گھنٹہ انگریزی، معاشیات، سائنس، ریاضی، عربی ادب، اردو ادب وغیرہ کا ہوتا ہے، اسی طرح ایک گھنٹہ بیچارے قرآن پاک کو بھی دے دیا جاتا ہے، اس طرح سرسری طور سے بھی پورا قرآن نہیں ہو پاتا، چہ جائیکہ اس پر تعمق اور تدبر کی نگاہ ڈالی جائے، چنانچہ اس کا نتیجہ بھی وہی برآمد ہوتا ہے، جس کے علاوہ کسی دوسرے نتیجہ کی توقع نہیں کی جا سکتی، طلبہ عمر کا اچھا خاصا حصہ ان دینی مدارس اور قرآنی مراکز میں گزار دیتے ہیں، مگر ان کے اندر قرآن پاک سے کوئی شغف نہیں پیدا ہوتا، ان کے دلوں میں قرآن پاک کی عظمت اور اس عطیۂ الٰہی کی قدر و قیمت کا کچھ بھی احساس نہیں

اُبھرتا، وہ برسہا برس تک ان دینی مدارس اور قرآنی مراکز کی آغوش میں رہتے ہیں، مگر فراغت کے بعد سیدھے تہذیب حاضر کی گود میں جا گرتے ہیں، وہ نئے ماحول میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان کا کہیں پتہ نہیں چلتا، نیا رنگ ان پر اس طرح چڑھ جاتا ہے کہ پرانے رنگ کا کوئی ہلکا نشان نظر نہیں آتا، اس طرح بوتے تو ہم ہیں، کاٹتے دوسرے ہیں، پودوں کی آبیاری تو ہم کرتے ہیں، مگر پھلوں سے دامن دوسروں کے بھرتے ہیں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، آج سے نہیں، مدتوں سے ہو رہا ہے، لوگ حیران ہیں کہ آخر ایسا کیوں؟ حالانکہ اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ان طلبہ قرآن کے سامنے قرآن پاک کی اصل حیثیت بے نقاب نہیں کی گئی، اس کی تعلیم و تفسیر میں کوئی اعلیٰ علمی معیار ملحوظ نہیں رکھا گیا، قرآن پاک جس غور و تدبر اور تحقیق و جستجو کا مستحق تھا، ہمارے مشائخ تفسیر نے اس سے تغافل برتا، ہمارے یہاں قرآن پاک کی مجالس بھی ہوتی رہیں اور تفسیریں بھی لکھی جاتی رہیں مگر قرآنی محاضرات یا قرآن کی تفسیروں کے لیے جس جگر سوزی اور جس کاوش و جستجو کی ضرورت تھی اس کا خیال نہیں رکھا گیا، ہم نے عافیت اسی میں سمجھی کہ روایات کے ہاتھ میں قرآن کی نکیل دے کر خود اس کی ذمہ داری سے بری ہو جائیں، قطع نظر اس سے کہ وہ روایتیں مضبوط اور قابل استناد ہیں یا ضعیف و مخدول اور قابل ترک ہیں۔

تفسیری کوششوں کی نوعیّت

ہمارے ان مفسرین اور مشائخ تفسیر کے علاوہ بھی جو لوگ کتاب الٰہی سے وابستہ ہوئے، اور جنھوں نے اس پر عام حیثیت سے کام کیا، وہ لوگ بھی روایات کی بے جا پاسداری کے علاوہ یہ سارے ہی لوگ اپنے ذوق ورجحان یا نظریہ ومسلک کے اثرات سے بھی آزاد نہ ہو سکے، انھوں نے قرآن پاک ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی بہت ہی تنگ دائروں میں اپنے آپ کو محصور کرلیا، اگر کوئی نحوی تھا تو اس نے خالص نحوی نقطۂ نظر سے قرآن کا مطالعہ کیا، اگر کوئی بدائع وصنائع یا معانی وبلاغت کا دلدادہ تھا، تو اس پر وہی ذوق غالب رہا اور اس نے قرآن پاک کا جائزہ اسی نقطۂ نگاہ سے لیا، اگر کوئی فقیہ تھا تو اس نے خالص فقیہانہ نقطۂ نظر سے قرآن کا مطالعہ کیا، اس نے اسے فقہ کی الکتاب سمجھ کر ہاتھ لگایا اور آیات کو ان کے سیاق و سباق سے الگ کر کے محض ان کے الفاظ سے چند در چند مسائل کا استخراج کیا، اگر کوئی منطقی وفلسفی تھا تو اس نے اسے خالص کلامی مباحث کا ماخذ سمجھ لیا اور وہ نری کلامی بحثوں میں اُلجھ کر رہ گیا، اگر کوئی لغوی تھا تو اس نے خالص لغوی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کیا، اور دیگر امور سے اسے کوئی سروکار نہ رہا، اسی طرح جو جس نظریہ ومسلک کا حامل تھا، اس نے مطالعۂ قرآن کے وقت اسی نظریہ ومسلک کی عینک استعمال کی، اور اسے مکمّل طور سے اپنے مسلک کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی، اگر کوئی

حنفی مکتب فکر کا تھا تو اس نے اس کے اندر حنفی اصولوں کا سراغ لگایا اور اسے فقہ حنفی کی تائید میں استعمال کیا، اگر کوئی مالکی تھا، تو اس نے اس کے اندر مالکی اصولوں کی جستجو کی اور فقہ مالکی کی بنیادیں فراہم کرنے کی کوشش کی، اگر کوئی حنبلی یا شافعی تھا تو اس نے اسے تمام تر اپنے فکر و مسلک کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی، اس نے مجموعی حیثیت سے یہ تصور دینے کی کوشش کی کہ قرآن پاک سے اسی کے مسلک کی تائید ہوتی ہے، اور اصلاً اسی کا مسلک قرآنی فکر کا آئینہ دار ہے، اگر کوئی معتزلی تھا، تو اس نے اسی نقطۂ نظر سے قرآن کا مطالعہ کیا، اور فتنۂ اعتزال کی کلک سے قرآن پاک کی تفسیر لکھی، اگر کوئی اشعری تھا، تو اس نے مطالعۂ قرآن کے وقت وہی عینک استعمال کی اور اس کے اندر اشعری مسلک کے لیے تائیدیں تلاش کیں، اگر کوئی طریقت کا امام تھا تو اس نے خالص تصوف کی زبان میں اس کی تفسیر کی، اور کتاب الٰہی کو سرتاسر تصوف کے اسرار و غوامض اور طریقت کے رموز و نکات کا گنجینہ بنا کر رکھ دیا، چنانچہ محمد ابن احمد ابن محمد شرنجی تھانیسری نے "کاشف الحقائق و قاموس الدقائق" کے نام سے ایک تفسیر لکھی، اس تفسیر کے لکھنے کا محرک کیا ہوا؟ وہ خود ان کے اپنے الفاظ میں سنیے:

"چونکہ اکثر تفسیریں شریعت اور عربیت کے مطالب سے بھری ہیں، لیکن کوئی تفسیر ایسی نہیں ہے جو طریقت و حقیقت کی باریکیوں پر مشتمل ہو، لہٰذا میں نے ارادہ کیا کہ ایک ایسی مختصر تفسیر لکھوں جو الٰہیات کے رموز و اسرار پر مشتمل ہو۔"

وہ کس انداز کی تفسیر ہے؟ اس کا اندازہ کرنے کے لیے بسم اللہ کی تفسیر ملاحظہ ہو، وہ فرماتے ہیں:

"ب سے اللہ کے بہائے جمال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور الف خفی سے اس کے جلال باکمال کی جانب اشارہ ہے، سں قہاریت وربوبیت کے سرخفی کا مظہر ہے اور م اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمام مکونات کا مالک و متصرف ہے۔"

اور اگر کوئی بریلوی مکتب فکر کا ہے، تو اس نے قرآن پاک کو سرتاسر نعت رسول ؐ اور منقبت رسول ؐ ثابت کرنے کی کوشش کی، اس نے یہ دعویٰ کیا کہ سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ ناس تک پورا قرآن اصلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیصدہ خوانی ہے، چنانچہ شیخ حاجی عبدالوہاب بخاری المتوفی ۹۳۳ھ نے قرآن پاک کی اسی انداز سے ایک تفسیر لکھی، جس کے سلسلہ میں صاحب نزہۃ الخواطر کے یہ احساسات ہمارے سامنے آتے ہیں:

"تقریباً تمام مطالب قرآنی کو مناقب نبوی کا رنگ دے دیا ہے اور اس میں وقائق و اسرار محبت بیان کیے ہیں، شاید انھوں نے اسے غلبۂ حال میں لکھا ہے، کیونکہ اکثر امور جو انھوں نے ذکر کیے ہیں صحیح نہیں ہیں۔"

(نزہۃ الخواطر ج: ۴۔ ص: ۲۲۳)

اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مَیں سمجھتا ہوں کہ عوام میں ان کے اس کام نے بڑی اہمیت حاصل کی ہو گی کہ سارا قرآن پیغمبر کی نعت ہے، عام مسلمانوں کے لیے بڑا دلکش فقرہ ہے، مَیں نہیں جانتا کہ ہندوستان کے سوا قرآن کی ایسی تفسیر کہیں اور لکھی گئی ہو۔" (نظام تعلیم و تربیت ۲/۳۰۹)

غرض قرآن پاک کو ہر ایک نے ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھا اور اپنے مخصوص رجحانات و خیالات کی روشنی میں اس کی تفسیر و تاویل کی، قرآن پاک کا مطالعہ اس طرح نہیں کیا گیا جس طرح کیا جانا چاہیے تھا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ قرآن پاک کو ہاتھ میں لینے سے پہلے اپنے لوحِ ذہن کو بالکل صاف کر لیا جاتا، اپنے پچھلے خیالات و نظریات سے بالکلیہ دستبردار ہو جایا جاتا پھر قرآن پاک پر ہمہ جہتی نظر ڈالی جاتی، ہر پہلو سے اس کا مطالعہ کیا جاتا، پوری وسعت اور گہرائی کے ساتھ اس پر تدبر کیا جاتا اور اس کی رُوح دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی، اسی کی روشنی میں اپنے فکر و عمل کی منزلیں طے کی جاتیں اور اپنے قول و عمل کی جولان گاہ متعین کی جاتی، ہمارا اپنا کوئی ذاتی نظریہ، کوئی ذاتی رجحان اور کوئی ذاتی مسلک نہ ہوتا، بلکہ سب کچھ قرآن سے مستفاد ہوتا، ہم اگر کوئی تفسیر لکھتے تو اس میں ہمارے ذاتی نظریہ و مسلک کی تصویر نہ جھلکتی، بلکہ اس کے اندر سے قرآن پاک کی ہی رُوح بول رہی ہوتی اور اسی کی تصویر نمایاں ہوتی، مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

ہماری یہ منشا ہرگز نہیں کہ اب تک قرآن پاک پر صحیح انداز سے کام ہُوا ہی نہیں، یا کسی نے قرآن پاک کو صحیح طور سے سمجھا ہی نہیں۔ العیاذ باللہ! اجلاہم

ایسا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں، یہ امت جو اپنی زرخیزی و مردم خیزی میں اپنی مثال آپ رہی ہے، بھلا ہم اس کے بارے میں ایسی بدگمانی کا شکار کیسے ہو سکتے ہیں، ہمارا تو دعویٰ ہے کہ اس اُمت میں ایسی ایسی مایۂ ناز ہستیاں پیدا ہوئی ہیں، یہاں علم و حکمت کے ایسے ایسے آفتاب و ماہتاب طلوع ہوئے ہیں کہ تاریخ عالم میں ان کی نظیر نہیں مل سکتی، لیکن ساتھ ہی ہمارا یہ بھی احساس ہے کہ ان کی قیمتی تحقیقات اور گراں قدر کاوشیں محفوظ نہ رہ سکیں، وہ تمام لعل و گہر زمانے کی گردشوں کی نذر ہو گئے، علم و حکمت کے وہ تابندہ موتی ہمیں دیکھنے کو نصیب نہ ہوئے، اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر حیرت کی جائے، یہ زمانے کی مستقل ٹریجڈی ہے کہ اس نے کبھی ارباب کمال کی قدر نہیں کی ہے، اس نے انھیں وہ مقام نہیں دیا ہے، جس کے وہ اہل رہے ہیں، اس نے ان کی چیزوں کو محفوظ کرنے میں ہمیشہ بے اعتنائی کا ثبوت دیا ہے، وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ زمانے کی عام سطح سے بلند ہوتے ہیں۔ ان کے افکار و نظریات عام مذاق سے بالکل ہی مختلف ہوتے ہیں، اسی لیے ان کی چیزوں کو زیادہ فروغ نہیں حاصل ہوتا، چونکہ وہ تحقیقات عام دلچسپی کی نہیں ہوتیں، اس لیے وہ قدر دانوں کے ایک محدود حلقے میں محدود ہو کر رہ جاتی ہیں، اور پھر رفتہ رفتہ زمانے کی گردشوں کا شکار ہو جاتی ہیں، یہی صورت حال ہمارے بزرگ اسلاف کے ساتھ پیش آئی ہے۔ ان کی قیمتی رائیں اور گراں قدر تحقیقات یا تو صفحۂ قرطاس پر آ ہی نہیں سکیں، یا اگر آئیں تو زمانے کی بدمذاقیوں نے ان کی قدر نہیں کی اور وہ رفتہ رفتہ غفلت و بے اعتنائی کی نذر ہو گئیں،

زمانے کے بازار میں رواج عموماً انھیں لوگوں کو حاصل ہوا ہے جنھوں نے اہلِ زمانہ کے عام مذاق کا لحاظ کیا ہے، جنھوں نے وقت کے رجحانات اور دلچسپیوں کی رعایت کی ہے، جنھوں نے اپنی کوئی نئی شاہراہ نکالنے کے بجائے عام اور پامال راستوں پر ہی چلنے کو ترجیح دی ہے، جنھوں نے انھی علوم و فنون میں طبع آزمائی کی ہے، جن کی اس وقت ہما ہمی رہی ہے، اور اسی نہج سے کی ہے، جس نہج کے لوگ خوگر رہے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی نے عام مذاق سے ہٹ کر کوئی نیا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، عام طریقوں سے ہٹ کر کچھ نئے خطوط پر کام کرنے کی جرأت کی ہے، بالفاظ دیگر اس نے کوئی تجدیدی رول ادا کرنے کی سعی کی ہے، تو زمانے نے اس کو بڑی مشکل سے قبول کیا ہے، اس نے عام طور سے اس کی راہ روکنے کی کوشش کی ہے، وہ جب تک لوگوں کے درمیان رہا، محسوس طور پر "اگر گل ہوں تو گلخن میں، اگر خس ہوں تو گلشن میں" کی دردانگیز تصویر بنا رہا، اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو دنیا نے اس کے ساتھ علوم و معارف کو بھی زمین میں دفن کر دیا، اس نے نہایت بے دردی کے ساتھ اس کے علم و حکمت کے تابندہ موتیوں کو بھی اس طرح تاریخ کے کوڑا خانے میں پھینک دیا کہ وہ بالکل نسیاً منسیاً ہو کر رہ گئے یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے، جس پر ہمیں کوئی تاریخی حوالہ دینے کی ضرورت نہیں، اولوالعزم صلحاء و مجددین کی پوری تاریخ ہی اس دردناک حقیقت کا ایک کھلا ہوا اعلان ہے۔

ہمارے نزدیک قرآن پاک کے سلسلہ میں جو قیمتی اور قابلِ قدر کوششیں

ہُوئی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی یہی صورتحال پیش آئی ہے، ہمارا جو اصل قیمتی اثاثہ تھا، وہ اپنی غفلتوں اور غیروں کی ستم رانیوں کا ہدف بن گیا، اور اب جو کچھ رہ گیا ہے، وہ اہلِ نظر کے سامنے ہے، تفسیر قرآن کے سلسلہ کی کچھ ابتدائی کوششیں ہیں جو علماء متاخرین نے کی ہیں اور جو اس بات کی مستحق ہیں کہ ہم ان کی قدر کرتے ہُوئے، انھیں مزید ترقی دینے، انھیں برابر غذا پہنچانے اور ان کے معیار کو زیادہ سے زیادہ بلند کرنے کی کوشش کریں، مگر افسوس کہ ہم نے اس ذمہ داری کو محسوس کرنے اور اس کے لیے اپنی طاقتیں مجتمع کرنے کے بجائے اپنے لیے وہ راستہ پسند کیا، جو آسان تو تھا مگر ہمارے شایانِ شان نہ تھا، ہم نے اس سلسلہ میں مزید کاوش کرنے کے بجائے انہی ابتدائی کوششوں پر قناعت کر لیا، اور اب ہمارے ہاں فہم قرآن کی معراج اور تدبر قرآن کا سدرۃ المنتہیٰ ہی یہ قرار پایا کہ ان تفسیری اقوال اور تفسیری روایات کے حافظ بن جائیں، اور زیادہ سے زیادہ ان کے حمل و نقل کی قدرت بہم پہنچالیں۔

علم و تحقیق کا فقدان

اس طرح رفتہ رفتہ قرآن پاک کے سلسلہ میں علم و تحقیق کا معیار گرتا چلا گیا، اس کے ساتھ جو حسن ظن اور بے پناہ عقیدت وابستہ تھی، جس کا وہ بجا طور پر مستحق بھی تھا، اس میں کمی ہوتی گئی، یہاں تک کہ صورتِ حال یہ ہو گئی کہ اب وہ علم و حکمت کا اتھاہ سمندر نہیں رہا کہ علم و حکمت کے بیش بہا

موتی دستیاب کرنے کے لیے اس میں غواصی کی جائے اور اس کے لیے عمریں صرف کردی جائیں، بلکہ اب وہ بس ایک مقدس آسمانی صحیفہ رہ گیا، جس کا حق صرف یہ ہے کہ اسے رٹ کر سینوں میں محفوظ کرلیا جائے، کسی میت کو بخشوانے کے لیے اس کا ختم کرلیا جائے، کسی وعظ کے موقع پر اس کی کچھ آیتیں پڑھ لی جائیں یا اس سے آگے کچھ داد تحقیق دینی ہو تو خود قرآن پاک پر تدبر کرنے کے بجائے رُوح المعانی بیان القرآن، بیضاوی، جلالین یا تفسیر کبیر وغیرہ کا مطالعہ کرلیا جائے، اگر اتنا کسی نے کرلیا تو اس نے گویا قرآن پاک کا حق ادا کردیا، مجموعی حیثیت سے پوری ملت اسلامیہ کا یہی ذہن بن گیا۔

غیبی انتظام

کتاب الٰہی کے ساتھ یہ کتنی بڑی زیادتی تھی، یہ زیادتی اتنی سنگین تھی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس جرم میں وہ ہم کو علم قرآن سے ہی محروم کردیتا۔ وہ ہم پر قرآن فہمی کے دروازے بند کردیتا، مگر اس کی رافت و رحمت کا پہلو غالب رہا۔ اس نے ہماری محرومیوں پر آخری مہر نہیں لگادی، بلکہ اپنے ایک بندۂ خاص کو منتخب فرمایا کہ وہ پھر سے امت کو قرآن پاک کا اصل مقام یاد دلائے، وہ دوبارہ ہمیں قرآن پاک کی عظمت و بزرگی کا احساس دلائے، وہ خود اس بحر بیکراں میں غواصی کرکے اس سے بیش بہا موتی حاصل کرلے، اور دوسروں کو بھی اس میں غواصی کا سلیقہ سکھلائے، میرا اشارہ ترجمان القرآن مولانا حمید الدین

فراہی رحمتہ اللہ علیہ کی طرف ہے، مولانا فراہی رحمتہ اللہ علیہ نے عمر عزیز کے مکمل چالیس سال کتاب الٰہی کے غور و تدبر میں صرف کر دیے، وہ چالیس سال تک پوری بے تابی اور جانفشانی کے ساتھ اس سمندر کی غواصی کرتے رہے، اور اس میں علم و حکمت کے تابندہ موتی تلاش کرتے رہے، وہ پورے صبر و استقامت کے ساتھ پتھروں کو تراش تراش کر لعل بدخشاں کی جستجو کرتے رہے، برسوں کی غواصی اور کوہ کنی کے بعد جب انھوں نے اپنی طلب صادق کا ثبوت فراہم کر دیا تو خدائے تعالیٰ کی خصوصی رحمت ان کی طرف متوجہ ہوئی اور انھیں اس خزانۂ علم و حکمت سے آشنا کیا گیا، جتنا بہت ہی برگزیدہ اور خاص الخاص بندوں کو ہی ملا کرتا ہے۔

علامہ فراہیؒ معاصرین کی نگاہ میں

چنانچہ علامہ فراہیؒ کے اہل علم معاصرین نے علامہؒ کی اس خصوصیت کا کھل کر اعتراف کیا ہے:

(۱) علامہ شبلی نعمانی

علامہ شبلی نعمانی رسالہ "الندوہ" میں دسمبر ۱۹۰۵ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں:

"عام قیاس یہ ہے کہ صاحب کمال کسی حالت میں گمنام نہیں رہ سکتا، تجربہ اور تاریخ بھی اسی کی شہادت دیتے آئے ہیں، لیکن

کوئی کلیہ مستثنیٰ سے خالی نہیں، مولوی حمید الدین جن کی ایک عجیب و غریب تصنیف کا اس وقت ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں، اس استثناء کی ایک عمدہ مثال ہیں..... یہ تصنیف (تفسیر نظام القرآن) خصوصاً اس زمانے میں اسلامی جماعت کے لیے اس قدر مفید اور ضروری ہے جس قدر ایک تشنہ لب اور سوختہ جاں کے لیے آب زلال ۔"

(۲) مولانا سید سلیمان ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی کو امام فراہیؒ کی وفات کی خبر پہنچی تو انھوں نے مجلہ "معارف" کے شذرات میں ان الفاظ میں ان کا ماتم کیا:

"الصلوٰة علی ترجمان القرآن"

آہ مولانا حمید الدینؒ!

الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن (مفسر قرآن کی نماز جنازہ) وہ صدا ہے جو آج سے ساڑھے چھ سو برس پیشتر مصر و شام سے چین کی دیوار تک ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ کی نماز جنازہ کے لیے بلند ہوئی تھی حق ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہو، اور کم از کم ہندوستان سے مصر و شام تک پھیل جائے کہ اس عہدہ کا ابن تیمیہ ۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء (۱۹ر جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ) کو اس دنیا سے رخصت ہوا، وہ جس کے فضل و کمال کی مثال آئندہ بظاہر حال عالم اسلام میں پیدا ہونے کی توقع نہیں

جس کی مشرقی و مغربی جامعیت عہد حاضر کا معجزہ تھی۔ عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجوایٹ، زہد و ورع کی تصویر، فضل و کمال کا مجسمہ، فارسی کا بلبل شیراز، عربی کا سوق عکاظ، ایک شخصیت مفرد، لیکن ایک جہان دانش، ایک دنیائے معرفت، ایک کائنات علم، ایک گوشہ نشین مجمع کمال، ایک بے نوا سلطان ہنر، علوم ادبیہ کا یگانہ، علوم عربیہ کا خزانہ، علوم عقلیہ کا ناقد، علوم دینیہ کا ماہر، علوم القرآن کا واقف اسرار، قرآن پاک کا دانائے رموز، دنیا کی دولت سے بے نیاز، اہل دنیا سے مستغنی، انسانوں کے ردو قبول اور عالم کی داد و تحسین سے بے پروا، گوشۂ علم کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ، وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک کے فہم و تدبر اور درس و تعلیم میں محو، ہر شے سے بیگانہ اور ہر شغل سے ناآشنا تھی، افسوس کہ ان کا علم ان کے سینہ سے سفینہ میں بہت کم منتقل ہوسکا — مسودات کا دفتر چھوڑا ہے، مگر افسوس کہ اس کے سمجھنے اور ربط و نظام دینے کا دماغ اب کہاں، جو چند رسالے چھپے، وہ عربی میں ہیں، جن کے عوام کیا، علماء تک ناقدر شناس۔ ان کی زندگی ہمارے لیے سرمایۂ اعتماد تھی، اور ان کا وجود دار المصنفین کے لیے سہارا تھا، افسوس کہ یہ اعتماد اور یہ سہارا جاتا رہا، اور صرف اسی کا اعتماد اور سہارا رہ گیا جس کے سوا کسی کا اعتماد اور سہارا نہیں، اس سے زیادہ

افسوس یہ ہے کہ یہ ہستی آئی اور چلی گئی، لیکن دنیا ان کی قدر و منزلت کو نہ پہچان سکی اور ان کے فضل و کمال کی معرفت سے ناآشنا رہی

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

زندگی گمنامی میں گزاری، مرنے کے بعد بھی گمنامی کا گوشہ تلاش کیا، متھرا میں، جہاں اپنے ایک ہم وطن ڈاکٹر سے، جو دس برس سے ان کے معالج خاص تھے، علاج کرانے تشریف لے گئے تھے وہیں انتقال فرمایا، عمر شریف ۶۷ سرسٹھ برس کے قریب تھی، مگر دائمی دردِ سر کی شکایت کے سوا قویٰ بہت اچھے تھے۔

ہم گنہگار ان کی مغفرت کی دعائیں کیا مانگیں کہ ان کے انفاس متبرکہ ہمہ تن یادِ خدا، صبر و رضا، شکر و تسلیم میں صرف ہوتے تھے، ان کی نماز ہمہ تن لطف محویت ہوتی تھی، ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، اپنی زندگی ہی میں اپنی مغفرت کے کئی خواب دیکھے تھے۔

خداوندا! ہمیں توفیق دے کہ ان کے نقشِ قدم پر چل کر ہم بھی تیری مغفرت کے سزاوار و مستحق ٹھہریں اور مرنے والے کو اپنی رضا و محبت کی بہشت عطا فرما کہ وہ اسی کا طالب تھا اور آخر عمر میں مرحوم کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ وہ چند مستعد طلبہ کو اپنے مذاق کے مطابق تیار کریں، چنانچہ کم از کم دو[1] طالب علموں کی خاص طور سے

---

[1] اشارہ ہے مولانا اختر احسن صاحب اور مولانا امین احسن صاحب کی طرف (ع)

انھوں نے دماغی تربیت کی، ہم سب کی دُعا ہے کہ وہ مدرسۃ اصلاح المسلمین (مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر) کو سنبھال لیں، جو مرحوم کی سب سے بڑی مادی یادگار ہے، تفسیر کے اجزاء جو مکمل ہوں گے، ان کی اشاعت کی فکر کی جائے گی، مگر آہ! کہ اس ناقدر شناس دنیا میں ان جواہر ریزوں کی کون قدر کرے گا اور کون سرمایہ بہم پہنچائے گا۔

رحمۃ اللہ علیٰ ذالک الجسد۔ (معارف دسمبر ۱۹۳۰ء)

(۳) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ترجمان القرآن جلد ۶ عدد ۶ کی اشاعت میں رقم طراز ہیں:

"عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ متاخرین میں قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لحاظ سے بہت کم لوگ اس مرتبے پر پہنچے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے علامہ فراہیؒ کو سرفراز فرمایا تھا، انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ کلام اللہ کے معانی میں صرف کیا، اور عربی زبان میں ایک ایسی محققانہ تفسیر لکھی جس کی نظیر متقدمین کی تصنیفات میں بھی کم ملتی ہے۔"

جس نے مسلسل چالیس برس تک قرآن مجید کی خدمت کی، جس نے معارف قرآنی کی تحقیق میں سیاہ بالوں کو سفید کیا، جس کی تفسیر کی

سے عرب و عجم کے ہزاروں مسلمانوں میں تدبر فی القرآن کا ذوق پیدا ہُوا، جس کی تحریروں کا ایک ایک لفظ گواہی دے رہا ہے کہ وہ قرآن کا عاشق ہے اور اس کے لفظ لفظ پر جان نثار کرتا ہے“

(۴) شیخ تقی الدین ہلالی

مجلۃ الضیاء لکھنؤ کے رجب ۱۳۵۲ھ کے شمارے میں علامہ فراہیؒ کے سلسلہ میں شیخ تقی الدین ہلالی کے یہ تاثرات ہمیں ملتے ہیں، یہ تاثرات ۱۰ رمضان ۱۳۴۲ھ کو لکھے گئے:

”علامہ حمید الدین صاحب کا ایک عربی دیوان ہے، جس کا کچھ حصّہ مَیں نے خود ان سے سُنا ہے بہت ہی فصیح و بلیغ اور دلپذیر، مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرنے والا، ان کے اندر زندگی کی رُوح پھونک دینے والا، جنگِ طرابلس، جنگ عظیم اور انگریزوں کی اسلام دشمنی کا تذکرہ بہت ہی مؤثر انداز میں، علامہ عربی بولنے پر پُوری طرح قادر ہیں، زبان انتہائی فصیح و بلیغ ہے، علماء ہند تو کجا علماء عرب میں بھی ایسے قادر الکلام خال خال ہیں، ان کی عمر تقریباً ۶۰ سال ہے، انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا جس کا نام مدرسۃ الاصلاح رکھا ہے، اس میں اصلاً قرآن پاک کی تعلیم ہوتی ہے، جو ان کی عزیز ترین متاع ہے، مَیں نے خود ان کی زبان سے ان کی تفسیر کا خطبہ سُنا، اسے سن کر میری آنکھیں ابل پڑیں، وہ مسئلہ خلافت کو خوب

سمجھتے اور اس سے پوری دلچسپی رکھتے ہیں، اس کے سلسلہ میں ان کا ذہن بالکل صاف ہے، اہلِ ہند کے برعکس وہ اپنے اندر ایک اجتہادی شان رکھتے ہیں، فقہ وعقائد میں وہ بہت ہی وسیع اور بلند ہو کر سوچتے ہیں، وہ کسی مسلک کے پیرو نہیں۔ البتہ عبادات میں وہ فقہِ حنفی کا لحاظ رکھتے ہیں، گندمی رنگ، خوبصورت اور وجیہ چہرہ، قد نکلتا ہُوا، داڑھی گول اور نورانی، وہ انگریزی، عربی، فارسی اور اُردو پر پُورا عبور رکھتے ہیں، مختصر یہ کہ میں اب تک جن جن شخصیات سے ملا، علم وفضل کے لحاظ سے ان کو سب سے بلند پایا۔"

(۵) مولانا عبدالحیٔ لکھنویؒ سابق ناظم ندوۃ العلماءؒ

مولانا عبدالحیٔ لکھنویؒ نزہۃ الخواطر ج ۸، ص ۳۰-۲۲۹ پر علامہ فراہیؒ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"وہ چوٹی کے علماء میں سے تھے، علوم ادبیہ سے پُوری واقفیت رکھتے تھے۔ انشاء وادب پر پُورا عبور حاصل تھا، ادبا اور ادبی علوم سے انھیں بڑا لگاؤ تھا، فہم وفراست، ذکاوت وذہانت، زہد وعفت، نیک نفسی اور بلند ہمتی کی وہ تصویر تھے، لایعنی باتوں سے بہت دُور، ابناء دنیا سے بالکل بے پروا، عربی علوم میں انھیں رسوخ حاصل تھا، بلاغت پر بڑی گہری نظر تھی، جاہلی دواوین اور

عربی اسالیب کلام پر وہ حاوی تھے، صحف سماویہ کا بڑا وسیع مطالعہ تھا، یہود و نصاریٰ کی کتابوں پر اچھی نظر تھی، ان کی ساری دلچسپیوں اور عرق ریزیوں کا محور قرآن پاک تھا، وہ قرآن پاک پر غور و تدبر کرتے اس کے بحر معانی میں غواصی کرتے، اس کے تمام اسالیب کو سمجھنے کی کوشش کرتے، ان کا عقیدہ تھا کہ پورا قرآن ایک مرتب و منظم کلام ہے، ساری آیات ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں، چنانچہ ان کی تفسیر نظام القرآن کا اصل الاصول یہی ہے۔"

(۶) مولانا مناظر احسن گیلانی

علامہ مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں:

"دیوبند میں میرا قیام کچھ دن تو طالب علم کی حیثیت سے رہا اور کچھ دن مدرسہ کی ملازمت اور خدمت میں گزرے کہ اچانک مجھے مقادیر نے حیدر آباد پہنچا دیا، مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی قرآن دانی کا شہرہ سن چکا تھا، خدا نے ان کی صحبت کی سعادت سے سرفراز فرمایا، اور قرآن کے چند جدید پہلو مجھ پر مولانا کی صحبت میں کھلے۔"

(مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص: ۵۰)

پھر "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت"، جلد دوم میں لکھتے ہیں:

"اسی طرح تفسیرِ قرآن کے سلسلہ میں ہندوستان کے بعض جدید کارنامے ایسے ہیں کہ کسی دوسرے اسلامی ملک کی طرف سے مشکل ہی سے کوئی ایسی چیز پیش ہو سکتی ہے جسے ہم ہندوستان کے ان کارناموں کے مقابلہ میں قابلِ لحاظ قرار دے سکتے ہوں،

قرآن کا ایک بڑا عمیق اور گہرا علم جس پر اس وقت تک بہت کم کام ہوا ہے، وہ قرآنی آیات اور سورتوں کے باہمی ربط کا مسئلہ ہے، عجیب بات ہے کہ باوجود مہم ہونے کے اس وقت تک قرآن کے اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے اور کوئی تفسیر اس خاص نقطۂ نظر سے ایسی نہیں لکھی گئی جسے خصوصی حسنِ قبول اہلِ علم کے حلقوں میں حاصل ہوتا، سب سے پہلے اس سلسلہ میں جو چیز یعنی نویں صدی کی ابتدا میں پیش ہوئی، وہ ہندوستان کے ایک عالم حضرت شیخ علی المہائمی کا کارنامہ ہے، یعنی اپنی تفسیر تبصیر الرحمن نامی میں علامہ مہائمی نے قرآن کے اس پہلو پر بحث کرنے میں بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے، اور ان کی تفسیر کی امتیازی صفت یہی شمار ہوتی ہے۔

مگر یہ تو پچھلے زمانے کی بات ہے، میں نے جیسا کہ عرض کیا، ولی اللّٰہی تجدید کے بعد ہندوستان نے اپنی نشأۃ ثانیہ میں جو کام اس سلسلہ میں انجام دیا ہے، میرا اشارہ حضرت الاستاذ مولانا حمید الدین الفراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "نظام القرآن" کی طرف ہے،

جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے (یعنی قرآن اور بائبل کے تعلقات اور ادبی مباحث) سب سے بڑی اور مشترکہ خصوصیت مولانا کی اس تفسیر کے تمام حصوں میں یہی ہے، کہ انھوں نے آیات قرآنی میں ربط پیدا کرنے کی ایسی عدیم النظیر کوشش فرمائی ہے۔ کہ بسا اوقات صرف آیات کے یہی روابط اس کی دلیل بن جاتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کے سوا اور کسی کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔"

(ص: ۲۷۹، ۲۸۰)

(۷) مولانا عبدالماجد دریاآبادی

مرحوم و مغفور مولانا عبدالماجد دریابادی ۱۱ر فروری ۱۹۳۶ء کے "صدق" میں لکھتے ہیں:

"علامہ حمیدالدین فراہیؒ اس دور میں علوم قرآنی کے لحاظ سے امام وقت تھے، وہ تفسیر قرآن میں ایک امتیازی درجہ رکھنے والے نہ صرف اپنے معاصرین اور متاخرین میں تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ تاریخ امت میں انھوں نے تفسیر کے بعض نئے اصول دریافت کیے، ان میں سب سے بڑا ان کا فلسفۂ نظم قرآن ہے، یعنی ہر سورہ بجائے خود ایک مستقل و منظم و مرتب کلام ہے، اور پھر اس طرح ہر سورہ اپنے مضمون کے لحاظ سے اپنی قبل والی اور بعد والی سورہ سے مربوط ہے۔ لکھ جانے کی جتنی ضرورت تھی، اس کے مساعد

توحالات نہ ہوسکے، پھر بھی عربی میں جتنا تحریر فرما گئے وہ بھی اچھا خاصہ ذخیرہ ہے، خدمت قرآن کے مدعی تو بہت ہیں، لیکن مولانا اپنی وقت نظر، عمق فکر، حکیمانہ ژرف نگاہی، علم وفضل، تبحرادبی، اور تقویٰ وطہارت کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر تھے۔"

(۸) مولانا شروانی

نواب صدریار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نے علامہ فراہی رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کی خدمت میں جو تعزیت نامہ ارسال فرمایا تھا، اس میں تحریر فرماتے ہیں:

"مجھ کو مولانا سے دیرینہ نیاز حاصل تھا، ابتدائی ملاقات کا ذریعہ علامہ شبلی مرحوم تھے، علی گڑھ کی پروفیسری کے زمانے میں ملا، پھر حیدرآباد میں ..... علی گڑھ کے دور میں بھی تدبر قرآنی کا شغف جاری رہا، روزانہ ۳ بجے شب سے صبح کے ۹ بجے تک اس میں وقت صرف کرتے تھے۔"

(۹) شاہ معین الدین ندوی

مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی مرحوم لکھتے ہیں:

"مولانا حمید الدین فراہیؒ ان علمائے کرام میں ہیں جنھوں نے اسلام خصوصاً قرآن پاک کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی

تھیں، کلام مجید کے فہم اور مشکلات قرآنی کے حل میں اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اور اس حیثیت سے وہ اس دور کے صحیح معنوں میں ترجمان القرآن تھے۔"

(۱۰) مولانا عبدالحق صاحب

مولانا عبدالحق صاحب بی، اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو اپنے رسالہ اُردو کی اشاعت جولائی ۳۶ء میں فرماتے ہیں:

"مولانا حمید الدین قرآن پاک کے والہ وشیدا ہی نہیں تھے، بلکہ اس کے نکات اور معانی جس طرح وہ سمجھتے تھے، شاید ہی کوئی دوسرا سمجھتا ہو، آخر عمر میں انھوں نے ساری توجہ ترتیب و نظام قرآن کی طرف مبذول کردی تھی، جس سے ان کی وسعت نظر اور تحقیق و تدقیق کامل کا ثبوت ملتا ہے یہ ان کی ساری عمر کی محنت اور کاوش کا نتیجہ تھا، انھوں نے قرآن مجید پر ہر پہلو سے غور کیا تھا، اور کوئی نکتہ ایسا نہیں تھا جو ان کی نظر سے بچا ہو۔"

(۱۱) الجمعیۃ

جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان "الجمعیۃ" ۱۴ ر جولائی ۳۶ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

"مولانا حمید الدین فراہی مرحوم و مغفور ان مخصوص بزرگوں اور کتاب

الٰہی کے عاشقوں میں سے ایک تھے جن پر جناب الٰہی سے فہم قرآن راہیں کشادہ ہوئیں اور سعادت ازلی نے جن کو قرآن کریم کے اسرار و حکم کا عارف کامل بنایا، مرحوم نہ صرف اللہ کی پاک اور روشن کتاب کے عاشق ہی تھے، بلکہ عربی زبان، عربی ادبیات اور عربی علوم و آداب کے ایک زبردست اور فقید المثال عالم بھی تھے، آپ نے قرآن کریم کا مطالعہ یونان کے ناپاک فلسفہ کی عینک لگا کر نہیں، بلکہ اس روشنی کی مدد سے کیا جو مخصوص بندوں کو مبداء فیاض سے عطا کی جاتی ہے، اور جس کی مدد سے قرآن کو قرآن ہی کے ذریعہ سمجھنے کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ مرحوم کی علمی قابلیت اور معرفت کتاب الٰہی کے متعلق دبلائے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ اپنی فکری صلاحیت، اجتہادی بصیرت اور قرآن کی معرفت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، بلاشبہ مرحوم کی بے پناہ قابلیت کا اندازہ ان کی قرآنی تصانیف اور اجزائے تفسیر سے لگایا جا سکتا ہے، اور معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مرحوم کی نسبت جو کہا گیا وہ شائبہ مبالغہ سے قطعاً پاک ہے۔

مرحوم کی علمی اور قرآنی قابلیت کے جو معترف آج بقید حیات ہیں، ان میں حضرت مولانا ابو الکلام آزاد اور علامہ سید سلیمان ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مرحوم علامہ شبلی ان کی استعداد قرآنی سے تاحیات بہرہ اندوز ہوتے رہے اور عرب کے جید اور مفکر علماء

اب تک ان کی بے نظیر تصنیف "امعان فی اقسام القرآن" کو حیرت اور استحسان کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ خدمت قرآن کی برکت سے مرحوم پر رحمت و مغفرت کے پھول برسائے، اور ان کے علوم و اجتہادات سے مسلمانوں کو بہرہ ور ہونے کی توفیق دے۔"

(۱۲) فاران

رسالہ فاران بجنور اپریل ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

"علامہ فراہی مرحوم ان مخصوص لوگوں میں تھے، جن پر فہم قرآن کی راہیں کشادہ ہوئیں اور جن کو کتاب الٰہی کے مزاج میں دخل حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، بلاشبہ موجودہ دور میں دنیائے اسلام کے اندر قرآن کا ماہر مرحوم سے بڑھ کر اور کوئی نہیں گزرا، آپ کو عربی زبان پر پوری بصیرت اور کتاب الٰہی کے فہم میں ذہنی بلوغ اور علمی کمال حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کا انداز بیان مجتہدانہ، تحقیق نہایت گہری اور مدبرانہ، اور اسلوب بیان نہایت دلکش اور عالمانہ ہے۔"

یہاں ان ساری تحریروں کا احاطہ مقصود نہیں، یہ چند خاص خاص لوگوں کے تاثرات ہیں جن سے فی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا کو قرآن پاک سے کیسا والہانہ لگاؤ تھا، اور اس کے نتیجے میں ان کے رب کریم نے انھیں

کتنا نوازا تھا اور اس خزانۂ علم و حکمت سے کس طرح بہرہ مند فرمایا تھا۔

مُبالغہ نہیں، حقیقت ہے

ایک عام قاری کو شاید گمان ہو کہ ان تحریروں میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، مگر وہ لوگ جو قرآن پاک کا ذوق رکھتے ہیں، اور جنھوں نے امام موصوف کی گراں قدر تفسیروں کا مطالعہ کیا ہے، انھیں کچھ بھی تعجب نہیں ہوگا، اگر مَیں یہ کہوں کہ یہ تحریریں بھی مولانا کی مکمل تصویر ہمارے سامنے نہیں لاتیں، مولانا کے معاصرین نے ان کے بارے میں جن تاثرات اور احساسات کا اظہار کیا ہے، ان کے اندر انھوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے، انھوں نے اپنی تحریروں میں غلو سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ وہ کم سے کم اعتراف ہے جو امام موصوف کے بارے میں کیا جا سکتا ہے، ورنہ وہ اس سے بہت آگے تھے، وہ نہ صرف وقت کے مفسر تھے، بلکہ وہ گزشتہ تمام مفسرین کے سرخیل تھے۔

علّامہ شِبلی کی مُبارکباد

یہ تنہا ہماری رائے نہیں، بلکہ ملک کے بالغ نظر اہل علم کا بھی یہی تاثر ہے، علّامہ شبلی نعمانی کو جب امام فراہی کا گراں قدر رسالہ تفسیر سورہ ابی لہب موصول ہُوا، تو انھوں نے ان کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اور ان کی تحقیقات کی داد دیتے ہوئے لکھا:

"تفسیر ابی لہب اور جمہرۃ البلاغۃ کے اجزا بغور دیکھے، تفسیر پر تم کو مبارکباد دیتا ہوں، تمام مسلمانوں کو تمھارا ممنون ہونا چاہیے۔

(مکاتیب شبلی جلد دوم)

مولانا سیّد سلیمان ندوی کا اعتراف

اسی طرح علامہ سیّد سلیمان ندوی امام موصوف کے گراں قدر رسالہ "اقسام القرآن" کا ذکر کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

"علی گڑھ کے قیام ہی کے زمانہ میں مولانا حمید الدین فراہی صاحب نے اقسام القرآن لکھی، یعنی اس مشکل کا حل فرمایا کہ خدا نے قرآن مجید میں قسمیں کیوں کھائی ہیں؟ اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے امام رازی نے تفسیر کبیر میں جستہ جستہ فقرے لکھے تھے، پھر ابن القیم نے التبیان فی اقسام القرآن لکھی، مگر مولانا حمید الدّین صاحب کی تحقیقات نے اپنی الگ شاہراہ نکالی اور حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں انھوں نے ایسی داد تحقیق دی کہ تیرہ سو برس میں اسلام میں کسی نے نہیں دی، مولانا شبلی مرحوم نے ان کے اس رسالے کا خلاصہ نہایت خوشی کے ساتھ "الندوہ" اپریل ۱۹۰۶ء میں شائع کیا اور عربی رسالہ اقسام القرآن کے نام سے الگ شائع کیا، اس کے بعد اس رسالہ کو مزید تحقیقات سے مؤید کر کے امعان فی اقسام القرآن کے نام سے علی گڑھ میں چھپوایا، اس وقت سے لے کر

آج تک مختلف مدعیان تحقیق نے اقسام القرآن پر جو کچھ لکھا ہے، وہ تمام تر مولانا کے خوان علم کی زلہ ربائی ہے۔"

مولانا مودودی کا اعتراف

اسی رسالہ اقسام القرآن کے سلسلہ میں مولانا مودودی کے درج ذیل تاثرات ہمارے سامنے آتے ہیں:

"یہ مولانا کے عربی رسالہ "امعان فی اقسام القرآن" کا ترجمہ ہے، اس میں مولانا نے قرآن مجید کی قسموں پر بہترین محققانہ بحث کر کے کتاب الٰہی کے ان تمام مقامات کو سمجھنے کے لیے ایک کلید فراہم کر دی ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے قسم کو بیان مدعا کا ذریعہ بنایا ہے، اگرچہ اس میں ان سب آیات کی تفسیر نہیں کی گئی ہے، جو قسم پر مشتمل ہیں، مگر جو اصولی بحث مولانا نے کی ہے، وہ ان تمام مشکلات کو دور کر دیتی ہے جو اس نوع کی آیات میں عموماً قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کو پیش آتی ہیں، فی الواقع قرآن کی خدمت کے سلسلہ میں جو چند بڑے کارنامے مصنّف مرحوم سے انجام پائے ہیں، یہ رسالہ بھی انہی میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، ان سے پہلے کسی نے اقسام القرآن کی گتھی کو اس خوبی کے ساتھ نہ سلجھایا تھا۔" (ترجمان القرآن ج ۱۹ عدد ۴: ۵، ۶)

علامہ رشید رضاؒ کی تقریظ

اس کے بعد اگست ۱۹۰۶ء میں اقسام القرآن کے علاوہ سورۃ ابی لہب

اور سورۂ قیامہ کی تفسیریں چھپیں اور اہلِ علم نے ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، علامہ سید رشید رضا صاحب المنار مصر جو خود تفسیر لکھ رہے تھے، انھوں نے ان پر مداحانہ اور معترفانہ تقریظ لکھی اور تحسین کی۔

علامہ سید سلیمان ندوی رح کی بے پناہ عقیدت

امام فراہی رح کی معرکۃ الآرا تصنیف "امعان فی اقسام القرآن" کا جو ایڈیشن مصر سے شائع ہوا تھا، اس ایڈیشن کے آخر میں علامہ سید سلیمان ندوی کے قلم سے امام فراہی اور ان کے بیش قیمت علمی کارناموں کا ایک سرسری تعارف بھی شامل تھا، اسی تعارف میں سید صاحب رح ایک جگہ لکھتے ہیں:

"مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ دار المصنفین کی مجلس اعلیٰ کے صدر تھے، دار المصنفین کی بنیاد مولانا کے ماموں زاد بھائی علامہ شبلی نعمانی کی یادگار کے طور پر رکھی گئی تھی، اس کی تاسیس میں مولانا کا بھی ہاتھ تھا، مولانا فرصت کے اوقات میں زیادہ تر تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے یا قرآن پاک کے مطالعہ اور اس پر غور و تدبر میں منہمک ہوتے، یا تلامذہ کو فیض پہنچانے میں مشغول رہتے، چنانچہ وہ قرآنی علوم و معارف کے اتنے لعل و گہر بکھیر گئے کہ قدماء کے ہاں اس کی مثال نہیں ملتی، قدر دانوں کو انھوں نے ایسے ایسے اسرارِ حکمت سکھائے، اور ان پر ایسے ایسے قرآنی نکات کھولے کہ پیش رو مفسرین کے ہاں ان کے کہیں تذکرے نہیں ملتے،

تفاسیر کے دفتر ان سے خالی نظر آتے ہیں۔"

سید صاحبؒ مزید فرماتے ہیں:

""مولانا فراہیؒ تدبر قرآن اور تعلیم قرآن کے لیے بالکل فارغ ہو گئے تھے، وہ کتاب الٰہی پر ہر پہلو سے غور کرتے۔ وہ ہر ہر زاویہ سے قرآن کے علوم و معارف اور اس کے اسرار و حکم کا سراغ لگاتے انھوں نے عمر کی نہ جانے کتنی بہاریں اسی چمن معرفت میں گزار دیں، وہ برسوں اس چمن کے لالہ و گل اور سوسن و نسترن سے اپنے دامن بھرتے رہے، چنانچہ انھیں وہ وہ چیزیں نظر آئیں، جو دوسروں کو نظر نہ آئیں، انھوں نے ایسی ایسی تجلیاں دیکھیں جن سے دوسرے مفسرین کی نگاہیں چوک گئیں، مفسرین جن گتھیوں کو سلجھانے سے عاجز رہ گئے تھے، مولانا کے ناخن حکمت نے وہ گتھیاں سلجھا دیں، جو گرہیں اب تک نہ کھل سکی تھیں، مولانا نے وہ گرہیں کھول دیں، جو مباحث اب تک تشنۂ تحقیق تھے مولانا نے ان کے سلسلہ میں داد تحقیق دی، مولانا کے سینہ میں قرآنی علوم کے چشمے ابلتے، زبان علم قرآن کی گہر افشانی کرتی اور قلم قرآنی مشکلات کی گرہیں کھولتا، تادم واپسیں مولانا کی یہی کیفیت رہی، یہاں تک کہ انھوں نے جان جان آفریں کے حوالہ کر دی۔"

سید صاحب نے امام فراہیؒ کے بارے میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ابتداءً ہم اسے مبالغہ یا ان کے حسن عقیدت کا کرشمہ سمجھتے تھے مگر جب ہم نے

براہِ راست امام موصوف کی تفاسیر اور قرآنی علوم سے متعلق ان کی دُوسری تصنیفات کا مطالعہ کیا تو ہمیں تسلیم کرنا پڑا کہ سید صاحب نے امام موصوف کے بارے میں اپنے جن تاثرات کا اظہار فرمایا ہے ان میں ذرا بھی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے، جو صاحبِ نظر بھی مولانا کی تصانیف و تفاسیر کا بغور مطالعہ کرے گا، وہ سید صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرنے پر خود کو مجبور پائے گا۔

امام فراہیؒ کَانَ خُلُقُہُ القرآن کی تصویر تھے

بلاشبہ امام فراہی کان خلقہ القرآن کی سچی تصویر تھے، ان کے اندر قرآن پاک کا نورِ حکمت اس طرح سرایت کر گیا تھا اس کی ضیا پاشیوں سے ان کا دِل و دماغ اس طرح منور ہو گیا تھا کہ اب وہ جو کچھ سوچتے، قرآن پاک کی ہی روشنی میں سوچتے جو کچھ لکھتے، قرآن پاک کے ہی آئینہ میں لکھتے، وہ قرآن پاک کی ہی وسعتوں میں پرواز کرتے، اسی کی پنہائیوں میں غوطے لگاتے، اسی کے چشمے سے سیراب ہوتے، اسی کی جنت میں سیر کرتے اور اسی کے موتیوں سے اپنے دامن بھرتے، گفتار میں، کردار میں، فکر اور تحقیق میں بس اسی کا جلوہ ہوتا، انھوں نے صحیح معنوں میں قرآن پاک کو وہ مقام دیا تھا جس مقام کا وہ مستحق تھا، کچھ بھی دیکھنا ہوتا تو قرآن پاک ہی کی روشنی میں دیکھتے، علم و تحقیق کے جس کوچہ میں بھی قدم رکھتے اُن کے ہاتھ میں یہی قندیل ہوتی، وہ قدیم و جدید کا بہترین سنگم تھے، علوم قدیمہ ہوں یا علوم جدیدہ سب کا انھوں نے

مطالعہ کیا، مگر جس وادی میں بھی قدم رکھا قرآن پاک کا چراغ ان کے ہاتھ میں تھا، قرآن پاک ہی ان کا رہبر اور وہی ان کا محور تھا، اُنھوں نے خود قرآن پاک کا مطالعہ بھی قرآن پاک کی ہی روشنی میں کیا اس کی تفسیر و تاویل کے لیے جو اصول اپنائے وہ قرآن پاک سے ہی ماخوذ تھے، انھیں جس طرح اپنے رب سے بے پناہ محبت تھی اسی طرح اس کے رسولؐ اور رسولؐ کے لائے ہُوئے کلام سے بھی بے پناہ محبت تھی، قرآن پاک ان کی محبوب ترین کتاب تھی، مختلف مواقع پر تم دوسرے ارباب تفسیر کو دیکھو گے کہ وہ کہہ دیتے ہیں "یہ لفظ قرآن پاک میں زائد ہے" اور یہ کہہ کر وہ بے تکلف آگے بڑھ جاتے ہیں، مگر یہاں تم معاملہ اس کے برعکس پاؤ گے، کلام الٰہی کی حکمت و عظمت اس کی فصاحت و بلاغت، اس کے حسن و جمال اور اس کی رعنائی و دلآویزی سے مولانا اس درجہ مسحور ہیں کہ وہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے، اس کی تہ میں اترتے، اس کی رُوح کو سمجھتے اور اس کی بلاغتوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے، وہ قرآن پاک کے کسی ایک شوشے کو بھی زائد تصور کرنے کے لیے کبھی آمادہ نہ ہوسکے، وہ قرآن پاک کے ایک ایک لفظ سے عشق رکھتے، اس کی ایک ایک ادا سے محظوظ ہوتے، اس کے ایک ایک انداز اور ایک ایک اسلوب کی حکمتوں کو دریافت کرتے، تم صبح کو ہوا خوری کے لیے نکلتے ہو، چمن زاروں اور مرغزاروں میں قدم رکھتے ہو مگر تم وہاں ٹھہرتے نہیں، چمن کے کتنے ہی شہزادے اور شہزادیاں اپنا سنگار کرکے اس انتظار میں کھڑی رہتی ہیں کہ کوئی دلدادۂ حسن وادا آئے اور ان کے حسن کا نظارہ کرے، وہ ہر آنے والے

کو دُور ہی سے دعوت نظارہ دیتی ہیں، مگر تم اپنا ایک راستہ پکڑے ہوئے بے گانگی سے گزر جاتے ہو، چمن کی دلربا شہزادیاں اس بے التفاتی پر ایک حسرت بھری نظر ڈالتی اور تمھاری بے ذوقی پر سر پیٹ کر رہ جاتی ہیں، تقریباً یہی کیفیت ہمارے مفسرین کی بھی رہی ہے، قرآن پاک جو سرتاسر علم وحکمت کا ایک چمن ہے، ہمارے مفسرین اس میں داخل ہوتے ہیں، مگر ان کے اس چمن میں داخل ہونے اور اس سے نکلنے کی بالکل وہی کیفیت ہوتی ہے جو کیفیت صبح کو ہوا خوری کے وقت تمھاری ہوتی ہے، مولانا کی کیفیت اس سے بالکل مختلف تھی ان کا کہنا تھا کہ ؎

چو نرگس این چمن نادیدہ مگزر　　　چو بو در غنچہ پیچیدہ مگزر

ترا حق دیدۂ روشن ترے داد　　　خرد مدہوش ودل خوابیدہ مگزر

وہ اس چمن میں داخل ہوتے تو اس سے نکلنے کا نام نہ لیتے، وہ گھنٹوں اور پہروں اس کی سیر میں مصروف رہتے، وہ بادصبا کی طرح ایک ایک لالہ وگل تک پہنچتے اور اس کو پیار کرتے، وہ بلبل کی طرح ایک ایک شاخ گل پر بیٹھتے اور صحبت گل سے محظوظ ہوتے، وہ ایک بھُو کی شہد کی مکھی کی طرح ایک ایک پتی اور ایک ایک پنکھڑی کا رس چوستے اور اس سے لذت گیر ہوتے، وہ عموماً رات کو دو بجے اس چمن میں داخل ہو جاتے اور اس سے نکلتے نکلتے دن کے نو بج جاتے، وہ گویا زبان حال سے کہہ رہے ہوتے ؎

چو میرم باصبا خاکم بیامیز　　　کہ جز طوف گلاں کارے ندانم

وہ محض الفاظ کی لغوی تحقیق، جملوں کی نحوی ترکیب اور آیتوں کے ظاہر

مفہوم پر قناعت نہ کرتے وہ ظہر القرآن کے ساتھ ساتھ بطن القرآن کا بھی سراغ لگاتے۔

ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

چنانچہ ان کا تأثر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایک آیت کی تہ میں علم و حکمت کے بے شمار خزانے رکھ دیے ہیں، ان کا عقیدہ تھا کہ قرآن پاک کی ہر آیت علوم و معارف کا گنجینہ ہے، ہر چھوٹی سی چھوٹی سورہ گویا ایک ایسا کوزہ ہے جس میں علوم و معارف اور اسرار و حکم کا ایک دریا موج زن ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک طالب قرآن کو ان کے ہاں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس کا وہ آرزومند ہوتا ہے، اتنا ہی نہیں، اس کو وہاں وہ کچھ مل جاتا ہے، جو اس کے تصور میں بھی نہیں ہوتا، ذہن میں قرآن پاک سے متعلق جتنے بھی سوالات ابھرتے ہیں، جن میں سے کچھ کا ہم نے پچھلے صفحات میں ذکر کیا، ان سب کے تشفی بخش جوابات یہاں مل جاتے ہیں۔

عرب جیسی خوددار اور صاحب نخوت و حمیت قوم نے اپنی ساری مخالفتوں کے باوجود قرآن پاک کے اعجاز بیان اور بلاغت کلام کے آگے کیوں کر گھٹنے ٹیک دیے، لبید جیسا قادر الکلام اور پر گو شاعر کہ جس کے ایک شعر پر شوق عکاظ میں تمام شعرائے وقت نے سجدہ کیا، اور بعد میں فرزدق نے اس کا ایک شعر سنا تو بے اختیار سجدے میں گر گیا، لوگوں نے پوچھا: یہ کیا ابو فراس ؟ اس نے جواب دیا: "تم بس یہ جانتے ہو کہ قرآن پاک میں سجدہ

کہاں کرنا چاہیے اور میں یہ جانتا ہوں کہ کون سے اشعار سجدے کے لائق ہوتے ہیں، اور کن اشعار پر سجدہ کرنا چاہیے۔"

(انتم تعرفون سجدۃ القرآن وانا اعرف سجدۃ الشعر)

بعد میں یہی لبید جب مسلمان ہو جاتے ہیں اور قرآن پاک کی آیتیں سنتے ہیں تو ہمیشہ کے لیے ان کی زبان بند ہو جاتی ہے، وہ شاعر جو تمام عرب شعراء کا مسجود، وقت کا ملک الشعراء اور عربی فصاحت و بلاغت کا مظہر کامل تھا، اس کے یوں ترک شعر پر لوگوں کو سخت تعجب ہوا، کسی نے پوچھا: اب آپ شعر نہیں کہتے؟ انھوں نے جواب دیا: کیا قرآن جیسی چیز مل جانے کے بعد بھی؟! اور بعض روایات میں ہے: کیا سورۂ کوثر جیسی سورہ مل جانے کے بعد بھی؟!

تفسیر سورۂ کوثر

قرآن پاک کی تمام سورتوں میں یا سورۂ کوثر کی تین چھوٹی چھوٹی آیتوں میں وہ کیا اعجاز اور وہ کیا سحر تھا وہ کون سی لطافت و بلاغت تھی جس نے لبید جیسے عظیم شاعر کی زبان بند کر دی، اس کا راز اگر جاننا چاہو، تو امام فراہیؒ کی تفسیر سورۂ کوثر کے علاوہ اور کہاں سے اس کا راز معلوم ہو سکے گا؟ چھوٹی سی ایک سطر کی سورہ ہے، مگر اس کی تفسیر کرتے ہوئے مولاناؒ نے حد درجہ اختصار پسندی کے باوجود ۱۲۰ صفحات لکھ ڈالے، اس میں علم و حکمت کے ایسے ایسے گوشے بے نقاب کیے کہ کوئی بھی قاری قرآن پاک کے اعجاز بیان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے، وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے

کوزے میں دریا یا سورہ ہیں سمندر سمو دیے ہیں، بلاشبہ ؎
ہر قطرۂ دریا ہیں دریا کی ہے گہرائی

تفسیر سورۂ عصر

حضرت امام شافعیؒ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: "اگر صرف سورہ عصر ہی نازل ہوئی ہوتی تو بھی کافی تھی۔" سورۂ عصر بھی صرف تین آیتوں کی سورہ ہے، مگر وہ بھی ایک شہر معانی ہے، اس کی اہمیت اور جامعیت کا اندازہ لگاؤ کہ امام شافعیؒ کی نکتہ رس نگاہوں کو اس میں علم وحکمت کی پوری ایک دنیا نظر آرہی ہے وہ فرماتے ہیں: اگر تنہا سورۂ عصر ہی نازل ہوئی ہوتی تو بھی کافی تھی۔" اس سورہ کے اندر کیا محاسن ہیں؟ اس کے اندر کیا امتیاز اور کیسا اعجاز ہے؟ اگر تم یہ جاننا چاہو تو کیا علامہ فراہیؒ کی تفسیر سورۂ عصر کے علاوہ بھی کہیں تمھیں اس کا جواب مل سکتا ہے؟ ساری تفاسیر کھنگال ڈالو، اور پھر اس تفسیر کو دیکھو، تم پر خود ہی اس تفسیر کی خصوصیت اور اس کی قدر وقیمت آشکارا ہو جائے گی۔

تفسیر سورۂ فاتحہ

یہ سورۂ فاتحہ، جو تم ہر نماز میں پڑھتے ہو، اس کی اہمیت اور فضیلت کے سلسلہ میں بہت سی حدیثیں اور سلف کے بہت سے اقوال ملتے ہیں، احادیث میں آتا ہے کہ اس سورہ کے بغیر نماز ہی ناقص رہتی ہے، اسی لیے

فقہ حنفی میں نماز کے اندر اس کی قرأت کو واجب اور فقہ شافعی میں اس کی قرأت کو فرض قرار دیا گیا ہے، حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں: سورۂ فاتحہ نماز کو پوری کرنے والی ہے، کیوں کہ یہ علم کو پورا کرنے والی ہے۔" اسی طرح بعض اہلِ نظر کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے فرمایا: "سورۂ فاتحہ قرآن پاک کا خلاصہ اور اس کا دیباچہ ہے۔" یا سورۂ فاتحہ قرآن پاک کی رُوح اور قرآنی مضامین کا عطر ہے۔ اس قسم کے متعدد اقوال ملتے ہیں، جن سے اس سورہ کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب حکیم کی سب سے پہلی سورہ اسے قرار دیا، یہی بات اس کی اہمیت اور جامعیت کی واضح دلیل ہے، ایک طالب قرآن کے ذہن میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سادہ سی سورہ کے اندر وہ کون سے رموز بیان ہوئے ہیں جن کی بنیاد پر یہ ایک شہرستان معانی اور علم و حکمت کا ایک گنجینۂ بے بہا قرار پائی، اس نکتہ کو اگر تم سمجھنا چاہو تو امام فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فاتحہ کے علاوہ اور کون تمھیں یہ نکتہ سمجھا سکے گا؟ تم بقیہ تمام تفسیروں کو دیکھ ڈالو، دیکھو، ان سے تمھاری تشنگی دور ہوتی ہے؟ پھر امام فراہیؒ کی ناتمام تفسیر سورۂ فاتحہ کو دیکھو اور اپنے ذہن کا جائزہ لو، کیا ایسا نہیں ہے کہ تمھارا دامن شوق علم و حکمت کے ایسے ایسے گراں قدر موتیوں سے مالا مال ہو گیا، جن کا تم پہلے تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے، اعجاز بیان اور بلاغت کلام کے ایسے ایسے گوشے تمھارے سامنے آگئے، جن سے تم بالکل بے خبر تھے۔

چند اصولی مباحث

یہ مولانا کے کسی ایک دو رسالے کا حال نہیں، جتنی سورتوں کی بھی تفسیریں مولانا نے لکھی ہیں، یا قرآنی مضامین پر جتنی بھی اصولی بحثیں کی ہیں، ان سب کی یہی کیفیت ہے، صاف محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قرآن پاک کا کوئی محرم اسرار ہے، جو پورے اطمینان قلب اور شرح صدر کے ساتھ کتاب الٰہی کے اسرار سربستہ کو بے نقاب کر رہا ہے، مولانا کے جس رسالے کو بھی تم ہاتھ میں لو گے، اسے حشو و زوائد اور لاطائل بحثوں سے بالکل پاک پاؤ گے، کتاب کے اندر جتنی بھی بحثیں ہوں گی، انتہائی قیمتی اور مفید ہوں گی، نہایت ٹھوس، مستحکم اور علمی دلائل پر مشتمل ہوں گی، یہاں اس مختصر سے رسالے میں ان تمام رسالوں کا تفصیلی تعارف کرانا ممکن نہیں، لہٰذا ہم انہی اشارات پر اکتفا کرتے ہیں، اہل ذوق خود دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڑھ سے ان رسالوں کو حاصل کر کے ان کا مطالعہ کریں، بعد میں اگر موقع ملا اور حالات سازگار رہے، تو ان شاء اللہ ہم مولانا کے اس عظیم تجدیدی کارنامہ کا تفصیل سے جائزہ لیں گے، البتہ اس چھوٹے سے رسالے میں اگر ہم امام فراہیؒ کی تفاسیر پر تفصیلی گفتگو نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا ضروری سمجھتے ہیں کہ انھوں نے تفسیر سے متعلق جو کچھ اصولی بحثیں کی ہیں، ان میں سے چند مباحث سے آپ کو روشناس کرا دیں، کہ ان مباحث کی روشنی میں تفاسیر فراہیؒ کی خصوصیت

اور قدر و قیمت کا کسی حد تک اندازہ لگایا جا سکے۔ استاذ امام فراہیؒ کی اصل تفسیر عربی زبان میں ہے، ہم اس کے کچھ اقتباسات یہاں اردو میں نقل کرتے ہیں:

تفسیری روایات کی حیثیت

مقدمۂ تفسیر کے صفحہ ۲۰ پر استاذ امامؒ رقم طراز ہیں:

"پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے، وہ خود قرآن ہے، اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا فہم ہے، پس میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے سب سے زیادہ پسند وہی تفسیر ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہو۔

بعض علماء نے اپنی کتابوں کی بنا روایات پر رکھی ہے، مثلاً ابن جریر طبریؒ، ان کی تفسیر کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اس کے مثل کوئی اور تفسیر نہیں لکھی گئی، لیکن اس میں اکثر حدیثیں ضعیف ہیں، مرفوع احادیث کا حصہ اس میں بہت تھوڑا ہے، انھوں نے دراصل اہل تاویل کے اقوال تمام اختلافات کے ساتھ جمع کر دیے ہیں، میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ صحیح احادیث میں اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے، تاہم میں روایات کو بطور اصل نہیں، بلکہ بطور تائید کے پیش کیا کرتا ہوں، پہلے ایک آیت کی تاویل اس

کی ہم معنی دوسری آیات سے کرتا ہوں، اس کے بعد تبعاً اس سے متعلق صحیح احادیث کا ذکر کرتا ہوں، تاکہ نہ تو ان منکرین ہی کو کسی اعتراض کا موقع ملے، جنھوں نے قرآن کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور نہ وہ ملحدین ہی کوئی اعتراض اٹھا سکیں جو ہمارے سر ایسی چیزیں تھوپتے ہیں جن کی قرآن میں کوئی اصل نہیں ہے، مقصود یہ ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام فرقوں کے درمیان ایک حجت قاطع اور ایک مرکز جامع کی حیثیت سے کام دے سکے :"

شانِ نزول

پھر آگے چل کر اسی کتاب کے صفحہ ۲۶ پر رقم طراز ہیں :

"اگر تم طمانیت اور یقین کے طالب ہو تو شان نزول کی تلاش میں سر رشتۂ نظم کو ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑنا، ورنہ تمھاری مثال صحرا کے اس مسافر کی ہو جاتے گی جو اندھیری رات میں ایک چوراہے پر پہنچ گیا ہو اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے. شان نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیے اور احادیث وروایات کے ذخیرے میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں، نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کر دیں، پھر سب سے زیادہ لائق اہتمام وہ شان نزول ہے جو خود نظم قرآن سے مترشح ہو رہی ہو، اس کو پوری مضبوطی سے پکڑو، کیونکہ جب کوئی حکم عام کسی خاص

حالت وصورت میں نازل ہوتا ہے تو وہ حالت وصورت اس
حکم کی علت وحکمت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔"

اصل اور فرع

آگے چل کر اسی کتاب کے صفحہ ۲۸ پر فرماتے ہیں:
"بعض ماخذ اصل واساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض فرع
کی، اصل واساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے، اس
کے علاوہ کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے، باقی فرع کی
حیثیت سے تین ہیں:
(۱) احادیث (۲) قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات،
(۳) گزشتہ انبیاء کے صحیفے جو محفوظ ہیں۔
اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن وشبہ کو دخل نہ ہوتا تو
ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے، بلکہ سب کی حیثیت اصل کی
قرار پاتی اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے پس
جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ
وہ روایات کے ذخیرے میں سے ان روایات کو نہ لے جو اصل
کو ڈھانے والی ہوں، بعض روایتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کی تاویل
نہ کی جائے تو ان کی زد براہِ راست اصل پر پڑتی ہے، اور ان سے
سلسلۂ نظم درہم برہم ہوتا ہے، لیکن تعجب کی بات ہے کہ بہت

سے لوگ آیت کی تاویل تو کر ڈالتے ہیں، لیکن روایت کی تاویل کی جرأت نہیں کرتے بلکہ بسا اوقات تو صرف آیت کی تاویل ہی پر بس نہیں کرتے، بلکہ اس کے نظام کی بھی قطع و برید کر ڈالتے ہیں، حالانکہ جب اصل و فرع میں تعارض ہو تو کاٹنے کی چیز فرع ہے، نہ کہ اصل۔

اور سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو ایسی روایتیں تک قبول کر لیتے ہیں جو نصوص قرآن کی تکذیب کرتی ہیں، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے جھوٹ بولنے کی روایات یا آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خلافِ وحی قرآن پڑھ دینے کی روایت، اس طرح کی روایات کے بارے میں ہم کو نہایت محتاط ہونا چاہیے، صرف وہ روایتیں قبول کرنی چاہئیں جو قرآن کی تصدیق و تائید کریں۔

خبر متواتر بھی قرآن کی ناسخ نہیں

آگے چل کر اسی کتاب کے صفحہ ۳۲ پر فرماتے ہیں:

"اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خبر اگرچہ متواتر ہو، قرآن کو نہیں منسوخ کر سکتی، اس کی یا تو تاویل کریں گے یا اس میں توقف کریں گے، لیکن اس کی خاطر قرآن کو منسوخ نہیں کریں گے۔ امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبل اور عام ائمہ حدیث جو حدیث کو قرآن کے لیے ناسخ نہیں مانتے، اگرچہ حدیث متواتر ہو پس جب یہ ائمہ حدیث حدیث کے معاملہ میں صاحب البیت کی حیثیت رکھتے ہیں، اس بات

کے قائل نہیں ہوئے تو اس بارے میں ہم فقہاء و متکلمین کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے اللہ ہم کو اس فتنے سے امان میں رکھے کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ رسولؐ، اللہ کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے، اس طرح کے مواقع پر تمام تر راویوں کے وہم اور ان کی غلطیوں کو دخل ہے، اور فریقین کے دلائل پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ حق کیا ہے، یہ مقام اس مسئلے کی تفصیل کے لیے موزوں نہیں ہے، اس لیے ہم اسی پر بس کرتے ہیں۔"

تفسیری روایات کی کیا حیثیت ہے؟ تفسیر قرآن کے باب میں ان سے کس حد تک استفادہ کیا جائے گا کون سی روایات قبول کی جائیں گی اور کون سی روایات رد کر دی جائیں گی، اور ان کے ترک و قبول کا پیمانہ کیا ہوگا، آیات اور روایات میں تعارض ہو تو کس کو ترجیح دی جائے گی اور کس کی توجیہ کی جائے گی؟ اس طرح کی مختلف اہم اور پیچیدہ بحثیں ہیں جن کے سلسلہ میں امام فراہیؒ نے اپنے مسلک اور نقطۂ نظر کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ امام موصوف نے ان مسائل میں جو مسلک اختیار فرمایا ہے، وہی مسلک سلف صالحین اور اکابر امت کا بھی رہا ہے، چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"فان قال قائل: فما احسن طرق التفسير؟ فالجواب: ان اصحّ الطرق فی ذٰلك ان يفسّر القرآن فما اجمل فی مكان فانّه قد فسّر فی موضع آخر وما اختصر فی مكان فقد بسط فی موضع آخر فان اعياك ذٰلك فعليك

بالسنۃ فانہا شارحۃ للقرآن وموضحۃ ۔"

(مقدمۃ فی اصول التفسیر ص : ۹۳)

(اگر کوئی کہے کہ تفسیر کا سب سے زیادہ بہتر طریقہ کیا ہے ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ قرآن سے کی جائے، کیونکہ ایک جگہ جو بات مجمل ہے، دوسری جگہ اس کی تفسیر کر دی گئی ہے، ایک جگہ جو بات مختصر ہے دوسری جگہ اس کی تفصیل کر دی گئی ہے، اب اگر تم اس سے عاجز ہو جاؤ تو سنت کی طرف رجوع کرو، کیونکہ وہ قرآن کی شرح اور اس کی توضیح ہے ۔")

یہ تنہا امام ابن تیمیہؒ کی بات نہیں، بلکہ سلف صالحین کا طریقہ ہی یہی تھا، وہ قرآن پاک کا مطالعہ قرآن پاک ہی کی روشنی میں کرتے. وہ ہر قرآنی اشکال کو قرآن ہی سے حل کرنے کی کوشش کرتے وہ اس سمندر میں غواصی کرتے اور اسی کی کلید سے اس کے بند تالوں کو کھولنے کی کوشش کرتے، لیکن بعد کے ادوار میں جب ذہنوں میں جمود پیدا ہو گیا اور علم و تحقیق کے سوتے خشک ہو گئے تو رفتہ رفتہ ان مسائل کے سلسلہ میں لوگوں کا نقطۂ نظر بدل گیا، انھوں نے عرق ریزی اور جانفشانی کے بجائے اسی میں راحت وعافیت سمجھی کہ روایت کے نام پر آنے والی ہر چیز کو مرحبا کیا جائے، خواہ وہ کتنی ہی بے بنیاد کیوں نہ ہو، اور پھر انھیں روایات کے لحاظ سے قرآن کی تفسیر کی جائے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ تفسیری روایات بالخصوص شان نزول کی روایات کے

باب میں ائمہ حدیث اور محققین امت کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ بیشتر ضعیف ہیں چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ومعلوم ان المنقول فی التفسیر اکثرہ کالمنقول فی المغازی والملاحم، ولھذا قال الامام احمد: ثلاثۃ امور لیس لھا اسناد، التفسیر والملاحم والمغازی ۔"

ویروی "لیس لھا اصل" (مقدمۃ فی اصول التفسیر ص ۵۸،۵۹)

(اور یہ بات معلوم ہے کہ تفسیر کے سلسلہ میں جو روایات آتی ہیں، ان میں سے بیشتر کی بالکل وہی کیفیت ہے جو مغازی اور ملاحم کی روایات کی ہے، اسی لیے امام احمدؒ نے فرمایا ہے: "تین چیزیں ہیں جن کی سند کا کوئی اعتبار نہیں: تفسیر، ملاحم اور مغازی" اور ایک روایت ہے کہ "ان کی کوئی اصل نہیں۔")

اسی طرح امام زرکشی فرماتے ہیں:

"لطالب التفسیر ماخذ کثیرۃ، امھاتھا اربعۃ: الاول النقل عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھذا ھو الطراز الاول، لکن یجب الحذر من الضعیف فیہ والموضوع، فانہ کثیر وان سواد الاوراق سواد فی القلب قال المیمونی سمعت احمد بن حنبل یقول: ثلاث کتب لیس لھا اصول: المغازی والملاحم والتفسیر۔"

(البرہان فی علوم القرآن، ج ۲ ص ۱۵۶)

(جو قرآن پاک کی تفسیر کرنا چاہتا ہو اس کے لیے بہت سے ماخذ ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم مآخذ چار ہیں، پہلا ماخذ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے آئی ہوئی روایات ہیں، اور یہی سب سے اوّلین بنیاد ہے، لیکن ان میں جو کمزور اور موضوع روایات ہیں ان سے پرہیز لازم ہے، کیونکہ وہ بہت بڑی تعداد میں ہیں، اور اوراق کی سیاہی آتی ہے ہیمونی کہتے ہیں کہ میں نے احمدؒ بن حنبل کو فرماتے ہوئے سُنا: تین طرح کی کتابیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں، مغازی، ملاحم اور تفسیر)

لیکن اس کے باوجود ہمارے مفسرین نے پوری فراخ دلی کے ساتھ اس طرح کی روایات قبول کریں اور کتب تفاسیر میں ان روایات کو بار حاصل ہوگیا، جو نہ صرف یہ کہ کمزور ہیں بلکہ واضح طور سے ظاہر قرآن سے ٹکراتی ہیں، وہ کلام کے رُخ کو بالکل دوسری طرف موڑ دیتی ہیں اور نظم کلام کو بالکل درہم برہم کر دیتی ہیں، چنانچہ امام ابنِ تیمیہؒ بار بار اس کا شکوہ کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"الموضوعات فی کتب التفسیر کثیرۃ" (مقدمۃ فی اصول التفسیر ص: ۲۲)

(تفاسیر میں موضوع روایات بہت ہیں)

امام موصوف مزید فرماتے ہیں:

"وفی التفسیر من ھٰذہ الموضوعات قطعۃ کبیرۃ" (مقدمۃ ۵)

(تفاسیر میں ان موضوع روایات کا بڑا حصّہ شامل ہے۔)

امام موصوف ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"فان الکتب المصنفۃ فی التفسیر مشحونۃ بالغث

والسمین والباطل الواضح، والحق المبین والعلم اما نقل مصدق عن معصوم واما قول علیہ دلیل معلوم وماسوی ذٰلک فاما مزیف مردود واما موقوف لا یعلم انہ بہرج ولا منقود وحاجۃ الامۃ ماسۃ الی فہم القرآن۔"

(مقدمۃ فی اصول التفسیر ص ۳۳ المطبوعۃ فی دار القرآن الکریم، الکویت)

(تفسیر کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں رطب ویابس بھرا ہوا ہے، ان میں ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا حق ہونا بالکل واضح ہے اور ایسی باتیں بھی ہیں جن کے باطل ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا، علم اصلاً یا تو وہ ہے جو نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح صحیح منقول ہو یا وہ بات ہے جس پر کوئی واضح دلیل ہو، اس کے علاوہ جو کچھ ہے، یا تو وہ کھوٹا اور نا قابل قبول ہے، یا اس قابل ہے کہ اس کے سلسلہ میں توقف کیا جائے کہ اس کے کھوٹے یا کھرے ہونے کا علم نہیں، امت کے لیے قرآن پاک کا سمجھنا اور اس کا فہم حاصل کرنا ناگزیر ہے، کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔)

اپنی بات کی مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں ایک مثال پیش کرتے ہیں:

تفسیر بالرّوایات میں غلو، مفسرین کی ایک واضح لغزش

سورۂ مریم کی ایک آیت ہے: "وان منکم الا واردھا کان علیٰ ربک حتماً مقضیاً" یہ آیت اپنے الفاظ و اسلوب اور موقع ومحل کے

لحاظ سے بالکل واضح ہے، لیکن اس کے باوجود مفسرین سے اس کی تاویل و تفسیر میں بالعموم لغزش ہوئی ہے، جس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ انھوں نے خود اس آیت کے الفاظ و اسلوب اور سیاق و سباق پر غور کرنے کے بجائے مکمل طور سے ان کمزور روایات پر اعتماد کر لیا جو کتب احادیث کے باب التفسیر میں مذکور ہیں۔

تمھاری آسانی کے پیشِ نظر ہم وہ پورا سلسلۂ آیات یہاں نقل کیے دیتے ہیں، ارشاد فرمایا:

وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا، أَوَلَا
يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا
فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ
حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا، ثُمَّ لَنَنزِعَنَّ مِن كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ
أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا، ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ
أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ
حَتْمًا مَّقْضِيًّا، ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظَّالِمِينَ
فِيهَا جِثِيًّا ۝ (مریم ۶۶-۷۲)

(اور انسان کہتا ہے، کیا جب میں مر جاؤں گا تو پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا؟ کیا یہ انسان اس بات کو یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اسے اس سے پہلے پیدا کیا، جب کہ وہ کچھ نہیں تھا، پس تیرے رب کی قسم ہم ان شیطانوں کو ضرور اکٹھا کریں گے، پھر ہم ان کو جہنّم کے گرد اس

طرح حاضر کریں گے کہ وہ دو زانو بیٹھے ہُوئے ہوں گے، ہم ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو چھانٹ کر الگ کریں گے جو خدائے رحمان کے آگے سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے رہے ہوں گے، ہم ان لوگوں سے بخوبی واقف ہوں گے جو اس جہنّم میں داخل ہونے کے زیادہ سزاوار ہوں گے، تم میں سے ایک ایک کو اس گھاٹ پر آنا ہے یہ تمھارے رب کے ذمّہ ایک قطعی طے شدہ بات ہے، پھر ہم متقین کو اس سے دور رکھیں گے، اور ظالموں کو اسی میں چھوڑ دیں گے بیٹھے ہُوئے۔)

اس آیت کے نظم و اسلوب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں ضمیر خطاب کے مخاطب وہی مجرمین ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے، اوپر کی باتیں بصیغۂ غائب کہی گئی ہیں، اور یہ بات ان کو مخاطب کر کے ارشاد ہُوئی ہے، ان دونوں اسالیب کے الگ الگ فائدے ہیں، جس طرح غائب کا اسلوب عدم التفات پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح خطاب کا اسلوب شدّت عتاب پر دلیل ہوتا ہے، قرآن مجید اور کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں کہ غائب کا اسلوب کلام دفعۃً خطاب کے اسلوب میں بدل گیا ہے، یہاں بھی اسی قسم کی تبدیلی ہُوئی ہے، چونکہ مقصود شدّت غضب کا اظہار ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ انہی مجرمین کو خطاب کر کے فرما رہا ہے کہ تم میں سے کوئی بھی جہنّم میں جانے سے بچ نہ سکے گا، بلا استثناء تم سب کو اس گھاٹ پر اُترنا ہوگا، یہ تمھارے رب کا بالکل قطعی فیصلہ ہے،

اس کو تمھارے رب نے اپنے اوپر لازم ٹھہرا لیا ہے۔

آیت کی یہ تاویل کس قدر واضح ہے، لیکن ہمارے مفسرین نے اس کا مخاطب تمام نوع انسانی کو مان لیا ہے، چنانچہ وہ ہر شخص کے لیے خواہ نیک ہو یا بد، جہنّم سے گزرنا ضروری قرار دیتے ہیں، بس اتنی خیریت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جہنّم پر پل صراط کے نام سے ایک پل ہوگا جس پر سے نیک لوگ تو گزر جائیں گے، البتہ بُرے لوگ جہنّم میں چھوڑ دیے جائیں گے، مفسرین کو یہ حیرانی محض اس وجہ سے پیش آئی کہ انھوں نے خود اسلوب کلام اور نظم کلام پر غور کرنے کے بجائے تمام تر اعتماد کمزور تفسیری روایات پر کر لیا، اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے قدم عموماً یہیں آکر پھسلتے ہیں، جہاں انھوں نے ان روایات پر تکیہ کیا، نظم کلام کا سارا سر رشتہ درہم برہم ہو گیا۔

ظاہر قرآن سے بھی نظر چوک گئی

حیرت ہوتی ہے کہ آیت کی یہ تاویل کرتے وقت انھیں سورۂ انبیاء کی اس آیت کا خیال نہیں رہا:

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ
لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ
خَالِدُونَ، لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ
هَٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝

(سورۃ الانبیاء: ۱۰۱، ۱۰۳)

(بے شک جن کے لیے ہمارا اچھا وعدہ ہو چکا ہے، وہ اس جہنم سے دُور رکھے جائیں گے، وہ اس کی سرسراہٹ تک نہ سنیں گے اور وہ ہمیشہ ہمیں اپنی من بھاتی نعمتوں کے درمیان رہیں گے، ان کو سب سے بڑی گھبراہٹ کی ساعت غمگین نہیں کرے گی اور فرشتے اس خوشخبری کے ساتھ ان کا خیر مقدم کریں گے کہ یہ ہے وہ دن جس کا آپ لوگوں سے وعدہ کیا جاتا تھا۔)

غور کرو، یہ آیتیں بتاتی ہیں کہ صالح اہل ایمان ہم سے دُور ہی دُور رکھے جائیں گے، وہ جہنم کی آہٹ اور سرسراہٹ تک نہیں سنیں گے، مگر ضعیف تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان نہ صرف یہ کہ جہنم سے قریب کیے جائیں گے بلکہ وہ اسی کے اوپر سے گزارے جائیں گے، اور ایسا محض اس وجہ سے ہوگا کہ خدائے تعالیٰ نے کوئی قسم کھالی ہے جس کا وہ پابند ہو گیا ہے۔ بتاؤ! کیا یہ روایتیں واضح طور پر ظاہر قرآن سے نہیں ٹکراتیں؟ مگر اس اختلاف و تعارض کے باوجود ہمارے بزرگ مفسرین نے ان روایات کو بے دریغ قبول کر لیا اور ان ہی کی روشنی میں آیت کی ایسی تاویل کر ڈالی جس کے لیے اس آیت میں سرے سے گنجائش ہی نہیں، یہ ایک مثال ہوئی، ورنہ تفاسیر سے اس طرح کی بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام فراہیؒ جگہ جگہ اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ روایات کے سلسلہ میں بڑی احتیاط اور دیدہ ریزی سے کام لیا جائے، روایات کی وجہ سے آیات کی تاویل نہ کی جائے، بلکہ آیات کی روشنی میں روایات کو جانچا پرکھا جائے جو روایتیں نظم قرآن سے

ہم آہنگ ہوں، انھیں قبول کر لیا جائے اور جو ظاہر قرآن سے ٹکراتی ہوں انھیں ترک کر دیا جائے، یا ان کے سلسلہ میں توقف سے کام لیا جائے۔

ایک غلط فہمی

تفسیری روایات کے باب میں امام فراہیؒ کا جو موقف ہے اس کی بنا پر ہمارے بعض بزرگوں کو یہ شکایت ہے کہ امام فراہیؒ روایات کے سلسلہ میں بے احتیاطی سے کام لیتے یا بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ وہ لوگ اس طرح کی رائیں قائم کرنے میں بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں، جہاں تک روایات کی قدر و منزلت اور احادیث کی عظمت و احترام کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ کس ہوشمند مومن یا عالم دین کا سینہ اپنے اندر احادیث و روایات کے لیے عظمت و احترام کے جذبات نہیں رکھتا ہوگا، مگر یہاں سوچنے کی اصل چیز یہ ہے کہ کیا روایات کے احترام کا تقاضا یہی ہے کہ بہت سی جو ضعیف اور سقیم روایات ان سے آگر مل گئی ہیں انھیں بھی بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے، کیا کسی لعل گراں کی قدر و منزلت کا تقاضا یہی ہے کہ اسے بہت سے کنکروں اور پتھروں کے ڈھیر میں چھپا ہوا رہنے دیا جائے، یا اس کی قدر افزائی اس میں ہے کہ کنکروں اور پتھروں کو الگ پھینک دیا جائے اور ہیرے کو اس ڈھیر سے نکال کر کسی تاج میں جڑ دیا جائے؟ کیا ہمارے ائمہ حدیث نے قوی اور ضعیف احادیث میں فرق و امتیاز نہیں کیا ہے کیا انھوں نے دلائل و قرائن کی روشنی میں صحیح روایات سے غلط روایات کو چھانٹنے کی کوشش

نہیں کی ہے؟ اور کیا احادیث و روایات کو جانچنے پرکھنے کے لیے قرآن پاک سے بھی زیادہ مضبوط و محفوظ اور قابلِ اعتماد کسوٹی کوئی ہو سکتی ہے؟ اس وقت ہم انھی اشارات پر بس کرتے ہیں، کہ یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، ان شاء اللہ ہم کسی مناسب موقع پر اس پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

استاذ امامؒ اسی کتاب کے صفحہ ۵۴ پر لکھتے ہیں:

"قرآن مجید بالکل قطعی الدلالت ہے، ہر آیت میں مختلف معانی کا احتمال محض ہمارے قلتِ علم و تدبر کا نتیجہ ہے جن علماء نے اپنی تفسیروں میں بہت سے اقوال نقل کر دیے ہیں، ان کا منشا یہ ہے کہ آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کو ہمارے سامنے رکھ دیں، اس میں سے قول راجح کا انتخاب انھوں نے ہماری تمیز پر چھوڑا ہے، پس یہ بات جائز نہیں ہے کہ ہم بغیر کسی ترجیح و انتخاب تمام رطب و یابس یاد کر چھوڑیں اور پھر حیرانی و سرگشتگی کی وادیوں میں ٹھوکریں کھاتے پھریں، مثال کے طور پر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر میں بقرہ کی آیت ایک سو اکیانوے (۱۹۱) کے تحت لفظ فتنہ کے معنی دیکھو، انھوں نے اس کے پانچ معانی بتاتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ سب صحیح نہیں ہیں، پس میں نے اپنی کتاب میں صرف وہی اقوال نقل کیے ہیں جو میری تحقیق پر صحیح اترے ہیں، اور یہی ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے، اقوال کی کثرت عموماً لوگوں کو بالکل حیران و درماندہ کر دیتی ہے، بسا اوقات لوگ مجرد اقوال نقل کر دیتے ہیں، ان

کے دلائل بیان نہیں کرتے، یہ ان اقوال کے کہنے والوں اور سننے والوں دونوں پر نہایت کھلا ہوا ظلم ہے، مَیں نے آیات کے معانی تفسیر کی کتابوں سے نہیں لیے ہیں، بلکہ خود آیات پر ان کے سیاق و سباق اور ان کی مماثل آیات کی روشنی میں غور کیا ہے، اس طرح جب چند آیتوں کے معنی روشن ہو گئے ہیں تب مَیں نے تفسیر رازی یا تفسیر طبری اُٹھائی ہے، ان میں کبھی تو ایسا ہوا کہ کوئی قول سلف کا میرے موافق مل گیا، کبھی مَیں سلف کے قول کے بالکل قریب پہنچ گیا اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ جو معنی میری سمجھ میں آئے تھے ان سے مجھے رجوع کرنا پڑا، اور ایسا بھی بارہا ہوا کہ کوئی مشکل ایسی پیش آگئی جس کے لیے مجھے عرصے تک توقف کرنا پڑا، لیکن ہر حال میں اشکال و ابہام کو مَیں نے اپنے علم و فہم کی کوتاہی اور غلط راویوں کی عامیانہ تقلید پر ہی محمول کیا۔ ....."

آگے لکھتے ہیں:

"بہر حال ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ قرآن نے ادائے مطلب کے لیے وہی اسلوب اختیار کیے ہیں جو سب سے زیادہ واضح، سب سے زیادہ اقرب اور سب سے زیادہ خوبصورت تھے، اور جہاں کہیں کسی اسلوب میں کوئی تصرف کیا ہے تو کسی اہم فائدے کے لیے کیا ہے، ہم ایک علیحدہ مقدمہ میں اس پر بحث کریں گے اور وہاں تاویل کے وہ اصول بیان کریں گے جو مختلف اقوال کے احتمال کا

سدِّباب کریں گے، آیات متشابہات اور حروف مقطعات کے باب میں بھی ہمارا یہی مذہب ہے، وہ اپنی دلالت میں زیادہ سے زیادہ واضح ہیں، ہم ایک مستقل مقدمہ میں ان پر بھی گفتگو کریں گے۔"

یہ امام فراہیؒ کے مقدمۂ تفسیر کے چند اقتباسات ہیں، ان اقتباسات سے تفسیر قرآن کے باب میں چند نہایت قیمتی اصول ہمارے سامنے آتے ہیں۔

قرآن قطعی الدلالت ہے

(۱) قرآن پاک قطعی الدلالت ہے، وہ بہت سی تاویلات و احتمالات کی گنجائش نہیں رکھتا، جیسا کہ عام اساتذۂ تفسیر کا خیال ہے، ان کا گمان ہے کہ ایک ہی آیت اپنے اندر بیک وقت مختلف معانی اور مختلف تاویلات احتمال رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مفسرین ایک ہی آیت کے تحت تاویلات و احتمالات کے انبار لگا دیتے ہیں، حالانکہ متعین طور پر کسی آیت کا کوئی ایک ہی مفہوم ہوسکتا ہے، کسی آیت میں مختلف تاویلات و احتمالات کا گمان دراصل ہماری قلتِ فہم اور عدمِ تدبر کا نتیجہ ہوتا ہے، زیادہ تر کتب تفاسیر کی یہی کیفیت ہے وہ ایک ہی آیت کے تحت مختلف احتمالات جمع کر دیتی ہیں، کوئی ایک صاف اور واضح مفہوم متعین نہیں کرتیں، جس کی وجہ سے ایک طالب قرآن مختلف اور متضاد اقوال کے درمیان حیران ہو کر رہ جاتا ہے وہ راستے ہی میں تھک کر بیٹھ جاتا ہے، منزل تک پہنچنا اسے نصیب نہیں ہوتا اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ ان بہت سی راہوں میں سے کون سی راہ اپنائے، مجبوراً وہ اپنے

ذہن میں بہت سی تاویلات اور اقوال اکٹھا کر لیتا ہے اور اس بات سے یکسر بے خبر ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سا قول صحیح، وزنی اور لائق ترجیح ہے۔

مطالعۂ قرآن کا طریقہ

(۲) قرآن پاک کے مطالعہ کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ ابتداء ہی میں تفسیر کی کتابوں کو کھول کر دیکھ لیا جائے کہ لوگوں نے اس آیت کے تحت کیا لکھا ہے، اور بس اسی کو حرفِ آخر سمجھ کر اس پر اکتفا کر لیا جائے، بلاشبہ لوگوں کی رائیوں اور ان کی تحقیقات سے پورا فائدہ اٹھایا جائے، مگر اس سے پہلے خود قرآن پاک کا براہِ راست مطالعہ کیا جائے، سیاق و سباق اور مماثل آیات کی روشنی میں اس پر غور و تدبر کیا جائے اور یہ جستجو کی جائے کہ وہ خود اپنے مفہوم کے سلسلہ میں کوئی رہنمائی دیتا ہے یا نہیں، ذاتی غور و مطالعہ کے ذریعہ سے خود آیات کا رخ اور ان کی سمت متعین کرنے اور ان کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، پھر مزید اطمینان قلب کے لیے تفاسیر کی طرف رجوع کیا جائے، اور اگر اربابِ تاویل نے ایک ہی آیت کے تحت مختلف تاویلات اکٹھا کر دی ہیں تو ان سب کو حفظ کرنے کے بجائے ان میں سے انتخاب کرنے اور کسی ایک تاویل کو ترجیح دینے کی کوشش کی جائے، اور اگر کسی ایک تاویل پر اطمینان نہ ہو رہا ہو تو برابر غور و تدبر کا سلسلہ جاری رکھا جائے اور خدائے رحمان اور معلّم قرآن سے برابر دعا مانگی جائے کہ وہ فہم قرآن کی راہیں کشادہ کرے، یہ جستجو اس وقت تک جاری رہے، جب تک کسی ایک مفہوم پر شرح صدر نہ

ہوجاتے اور صحیح تاویل صبح درخشاں کی طرح روشن ہو کر سامنے نہ آجائے۔

قرآنی اسالیب کا تنوّع

(۳) قرآن پاک نے کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے وہی اسالیب اختیار کیے ہیں جو عربیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ واضح، سب سے زیادہ موزوں اور سب سے زیادہ خوبصورت ہیں، اور کہیں بھی اگر اسلوب میں کوئی تصرف کیا ہے تو کسی گہری حکمت و افادیت کے پیش نظر ایسا کیا ہے، اسلوب کی کوئی بھی تبدیلی حکمت و بلاغت سے خالی نہیں ہو سکتی، لہٰذا کسی طالب قرآن کے لیے جائز نہ ہوگا کہ وہ کسی اسلوب سے یُوں ہی سرسری طور سے گزر جائے، اس کے برعکس وہ ہر اسلوب کی تہ میں اترنے کی کوشش کرے اور سراغ لگائے کہ حکمت و بلاغت کا وہ کون سا مخفی پہلو ہے جس کی طرف ہمارے رب نے ہمیں متوجہ کرنا چاہا ہے، اسالیب کی ذرا ذرا سی تبدیلیوں میں نہ جانے کتنی حکمتیں اور کتنے اسرار پوشیدہ رہتے ہیں، جن سے ہم تیزی سے گزر جاتے ہیں اور ان کے فہم سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اعجازِ قرآن کے لوازم میں سے ہے

اسی مقدمہ تفسیر کے صفحہ ۴۸ پر مولاناؒ لکھتے ہیں:

"جس طرح ایک سپہ سالار اپنی افواج کو مختلف ڈھنگ سے ترتیب دیتا ہے اور اس کی تدبیروں اور مصلحتوں کو صرف ماہرین فن ہی سمجھ

سکتے ہیں، عوام صرف فتح و غلبہ سے ہی اس کی مہارت فن کا اندازہ کر سکتے ہیں، اسی طرح قرآن مجید میں ایک ہی بات مختلف طریقوں سے کہی جاتی ہے اور صرف ماہرین بلاغت ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ان مختلف طریقوں میں الگ الگ کیا خوبیاں اور کیا بلاغتیں ہیں۔

ہمارے بعض مفسرین کے نزدیک اس کا مقصد قرآن کے اعجاز کو ظاہر کرنا ہوتا ہے، لیکن میرے نزدیک اعجاز قرآن کے اغراض و مقاصد میں سے نہیں بلکہ اس کے لوازم میں سے ہے، اس کائنات کے اندر ایک چھوٹے سے چھوٹے دانے بلکہ ایک حقیر سے حقیر ذرے سے لے کر اس گنبد گردوں تک جو کچھ ہے سب معجزہ ہی معجزہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی خلقت بھی اظہار اعجاز کے لیے نہیں ہوئی ہے، بلکہ ان حکمتوں کے تحت ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی تخلیق میں ملحوظ رکھی ہیں، یہ اور بات ہے کہ دوسرے ان کو بنانے سے عاجز ہیں، اس لیے ثابت ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہیں۔

ایک ہی شے مختلف روپ میں

قرآن میں ایک ہی چیز کبھی عمود کی حیثیت سے آتی ہے، کبھی ضمنی مضمون کی حیثیت سے، کبھی ایک چیز اجمال کے ساتھ آتی ہے، کبھی تفصیل کے ساتھ، کبھی ایک چیز موخر ہوتی ہے، کبھی مقدم، کبھی تنہا ہوتی ہے، کبھی اپنے مقابل کے ساتھ، کبھی کسی چیز کے ساتھ اس کا جوڑ ہوتا

ہے کبھی کسی چیز کے ساتھ بالکل یکساں مضمون مختلف سورتوں میں مختلف ترتیبوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں، ظاہر ہے کہ جب ایک ہی شے اپنے مختلف پہلوؤں سے تمھارے سامنے جلوہ گر ہوگی تو اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے اور پوری طرح پہچان لینے میں تمھیں دِقّت نہیں ہوگی، اگر ایک ادا سے نگاہ چوک گئی تو دوسرا جلوہ سامنے آجائے گا، قرآن مجید کی اسی صفت کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ○

(دیکھو! کس طرح ہم ہیر پھیر کر اپنی آیتیں بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ سمجھیں)

اور ہر ترتیب میں ایک خاص حکمت ملحوظ ہوتی ہے۔ ہم بالاجمال ترتیب کے مختلف طریقوں کی طرف یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں اور اوپر جن پانچ امور کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں:

عمود ہر سورہ کا ایک ہی ہوتا ہے

سب سے پہلے عمود پر غور کرو، عمود ہر سورہ کا ایک ہی ہوتا ہے، لیکن یہی ایک بسا اوقات بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے، مثلاً سورۂ حجرات کے عمود کو لو، ہے یہ ایک ہی بات، گو لغت میں ہم اس کے لیے ایک ہی جامع لفظ نہ پاسکیں، تعبیر مطلب کے لیے یُوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سورہ میں بد خلقی پر ملامت اور جھڑکی ہے،

عام اس سے کہ وہ بدخلقی خیال سے تعلق رکھتی ہے، یا قول سے، یا عمل سے، چنانچہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گفتگو میں سبقت، آپ کی آواز پر آواز بلند کرنے، عام آدمیوں کی طرح آپ کو پکارنے، بے ضرورت اور بے موقع آپ کو زحمت دینے اور کسی فاسق کی اطلاع پر کسی قوم پر ٹوٹ پڑنے کی ممانعت کی گئی ہے، پھر مسلمانوں کی دو جماعتوں میں اصلاح، ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت اور ان کے درمیان عدل کا حکم دیا گیا ہے اس کے بعد لوگوں کے ساتھ تمسخر سے ان کی عیب جوئی سے ننابز بالالقاب سے، بدگمانی سے، تجسس سے، غیبت سے، غرور نسب سے، ادعائے پارسائی سے اور پھر سب سے آخر میں سب سے بدترین شے، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے اسلام کا احسان دھرنے سے روکا گیا ہے۔

یہ ایک مثال میں نے اس لیے پیش کی ہے کہ تم وحدت میں کثرت کا جلوہ دیکھ سکو، اس کے حسن نظام پر مفصل بحث اپنے مقام پر ملے گی۔ عمود کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سورہ کے اندر اپنی حقیقت کے اعتبار سے سب سے عظیم الشان بات ہو، اس کے لیے عظیم الشان بات نہیں بلکہ سب سے زیادہ جامع بات ہونا ضروری ہے، کیونکہ وہ سورہ کے تمام مطالب کے لیے شیرازہ کا کام دیتا ہے، ہاں بیان کے لحاظ سے وہ سورہ کے اندر سب سے زیادہ اہم چیز ہوتی ہے، سورۂ نور کے اندر آیت نور کو دیکھو، وہ کس طرح آفتاب تاباں بن کر تنگ

رہی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ سورہ کے اندر عمود کی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ ایک بالکل ضمنی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے، عمود اس کا عورتوں سے متعلق حسن ادب کی تعلیم ہے، اسی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ یہ سورہ عورتوں کو پڑھائی جائے تاکہ وہ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کو معلوم کر سکیں۔

یہ تو کسی چیز کے طور عمود آنے کی شکل ہوئی، ضمناً آنے کی صورت یہ ہے کہ کوئی چیز بطور دلیل یا بطور مثال آجائے، یا بعد میں آنے والے دعوے کے لیے کسی مثال یا حجت سے تمہید استوار کی جائے، یا سبق کی توسیع یا تحدید کی جائے، یا کوئی سوال پیدا ہو رہا ہو اس کا جواب دیا جائے، یا اپنے مابعد کی تمہید ہو، یا کوئی مناسب مقام حکمت کی بات بر سبیل تذکرہ آجائے، یا سبق کی تفصیل کی جائے، یا وعدہ وعید اور مدح وذم کے ذریعہ سے اس پر ابھارا جائے، یا کسی مزید علم کا بیان ہو، یا موقع کی مناسبت سے حمد الٰہی اور صفات رب کا بیان ہو، اور یہی آخری چیز قرآن حکیم کی روح ہے۔

آیات کے اندر باہم ترتیب و مناسبت

اب ہم مختصراً اوپر کی باتوں میں سے پانچویں بات کی کسی قدر وضاحت کرنی چاہتے ہیں، یعنی اس بات کی کہ کس طرح ایک شے کبھی ایک چیز کے ساتھ ملائی جاتی ہے اور کبھی دوسری شے کے ساتھ اگر تم اس

بات کا یقین رکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نہایت اعلیٰ حکمت مدِّ نظر رکھی ہے، تو جب تم ایک شے کو کسی شے کے ساتھ دیکھو گے تو ضرور ان دونوں کے درمیان مناسبت تلاش کرو گے، یہ تلاش ایسے مخفی وقائق حکمت تک تمھاری رہبری کرے گی، جن وقائق تک وہ شخص کبھی نہیں پہنچ سکتا جو تدبر کا عادی نہ ہو، ایک ہی شے کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ ایک پہلو سے وہ کسی چیز سے مناسبت رکھتی ہے اور دوسرے پہلو سے کسی چیز سے، مثلاً دیکھو نماز اور حج میں کتنی مناسبتیں موجود ہیں، دونوں ذکر الٰہی کی صورتیں ہیں، دونوں بدنی عبادتیں ہیں، دونوں بیت اللہ سے تعلّق رکھتی ہیں، نیز رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے کہ طواف نماز ہے۔

نماز میں اتنی مناسبتیں تو حج کے ساتھ تھیں، اب روزہ کے ساتھ نماز کی مناسبتوں پر غور کرو، دونوں کسی مخصوص جگہ کی قید سے آزاد ہیں، دونوں کی بنیاد صبر پر ہے، یہاں تک کہ پہلے ادیان میں سکوت بھی روزہ کے شرائط میں شامل تھا، اس اعتبار سے گویا نماز نفس کا باطنی روزہ ہے۔

پھر نماز کی مناسبت زکوٰۃ کے ساتھ دیکھو، یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے کمال کو پہنچتی ہیں، دونوں ایک ہی جڑ سے پھوٹی ہیں، نماز کی حقیقت بندے کا خدا کی طرف محبّت اور خشیت سے مائل ہونا ہے، اور زکوٰۃ کی حقیقت بندے کا

اللہ کی طرف محبت اور شفقت سے مائل ہونا ہے، پس کمال سعادت کے لیے دونوں لازمی ٹھہریں اور ان دونوں کی رُوح محبت ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ خود دین کی حقیقت بھی محبت، گداز باطنی اور لطافت احساس ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام صفات میں رحم کو مقدم کیا اور فرمایا:

وسعت رحمتی کل شیئ (میری رحمت ہر چیز کو حاوی ہے)

ظاہر ہے کہ دین کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا عکس اس کے بندوں میں نظر آتے اسی چیز کی وجہ سے انسان خدا کی خلافت کی عزت سے سرفراز ہوا ہے، پس نماز کی مناسبتوں پر غور کرنے سے ہم کو دین کی اصل اور تمام شرائع کی رُوح کا سراغ لگ گیا، یہی حقیقت تورات اور انجیل سے بھی معلوم ہوتی ہے (مزید تفصیل کے لیے دیکھو مقدمہ ۱۰)

ایک اور ذرا دقیق مثال لو، سورۂ عقود (سورۂ مائدہ) میں اللہ تعالیٰ نے پہلے کھانے کی چیزوں میں سے جو چیزیں جائز ہیں ان کو بیان کیا پھر جن عورتوں سے نکاح جائز ہے ان کو بیان کیا پھر وضو کا ذکر فرمایا، اب ان کی مناسبت پر غور کرو گے تو دو چیزیں تمھارے سامنے آئیں گی ایک شے اور ایک شرط شے، شرائط میں سے وہ چیزیں بیان کیں جن سے یہ چیزیں پاک ہوتی ہیں، اب دیکھو ذبح چوپایوں کو پاک کرتا ہے، پھر اور نکاح سے عورتیں پاک ہوتی ہیں اور وضو نماز کی پاکی ہے، پھر اس

تمام حقیقت کو آخر میں یہ فرما کر کھول دیا:

مَا يُرِيدُ اللهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلٰكِنْ يُّرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ ۝

(اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے، بلکہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے۔)

یہ شرائط کا بیان تھا، اب اشیاء پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہاں تین چیزیں بیان کی گئی ہیں، طیبات طعام، طیباتِ نساء اور نماز، اگر تعمق کی نگاہ سے دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ یہ دنیا چونکہ عالم کون و فساد ہے، اس وجہ سے یہاں تین عالموں، عالم شخص، عالم نوع اور عالم روح کے نقص کی تلافی تین چیزوں، طعام، نکاح اور نماز سے فرمائی ہے، پھر طعام اور نکاح میں ایک اور بھی مناسبت ہے کہ دونوں میں سے جو چیزیں حرام ہیں ان کی تخصیص کردی گئی ہے، چنانچہ دیکھو! دونوں آیتیں بالکل ایک ہی نہج پر وارد ہوئی ہیں:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ (الآیۃ)

تم پر تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں حرام ہیں۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ (الآیۃ)

تم پر مردار اور خون حرام ہے۔

اسی طرح نماز اور نکاح میں مناسبت کا ایک اور پہلو بھی ہے، نکاح بدکاری کی آلودگیوں سے حفاظت کرتا ہے اور نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ

(بلاشبہ نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔)

یہ مناسبت دونوں میں پاکیزگی کے پہلو سے تھی، اب سورۂ بقرہ میں تخفیف کے پہلو سے ان کی مناسبت پر غور کرو، نماز کے متعلق فرمایا:

حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ ..... فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُکْبَانًا،

(نمازوں کی حفاظت کرو..... پس تمہیں اگر اندیشہ ہو تو پیادہ یا سوار جس حال میں ہو، نماز پڑھ لو۔)

جس طرح نکاح کی حفاظت حتی الامکان واجب ہے، مگر ضرورت کے وقت طلاق کی اجازت دے کر تخفیف کردی گئی ہے، ٹھیک اسی طرح نماز کی حفاظت کی تاکید کے باوجود ضرورت کے وقت اس میں بھی تخفیف کردی گئی ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں جب کوئی چیز کسی دوسری چیز کے ساتھ ملائی جاتی ہے تو اس میں "قرآن بخوم" کے مانند گوناگوں مناسبتیں ہوتی ہیں اور ہر ترتیب اپنے اندر ایک نیا جلوۂ حُسن و جمال رکھتی ہے۔"

یہ بھی امام فراہیؒ کے مقدمۂ تفسیر کی ایک فصل ہے، جس سے چند نہایت اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، قرآن پاک کے مختلف اسالیب، آیتوں اور آیتوں کے اجزاء کی باہمی ترتیب اور ترتیب و اسالیب کی موقع بہ موقع تبدیلیاں یہ ساری چیزیں اس لیے نہیں ہیں کہ ان سے قرآن پاک کے اعجاز کا اظہار ہو، اعجاز قرآن پاک کی غایت نہیں، بلکہ کلام الٰہی کے مقتضیات اور خصوصیات میں سے ہے، عام خیال

یہی ہے کہ قرآن پاک میں اسالیب کا تنوع، اس کی فصاحت و بلاغت اس کے اعجاز کے اظہار کے لیے ہے، یہی وجہ ہے کہ مفسرین ایسی جگہوں پر کچھ ٹھہرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، وہ ان تمام مواقع سے سرسری طور سے گزر جاتے ہیں، اس طرح اسالیب کے اس تنوع میں جو قیمتی اسرار پوشیدہ ہیں، یا اجزاء کی ترتیب میں جو گوناگوں حکمتیں پنہاں ہیں، ان سے وہ چوک جاتے ہیں، یہ فہم قرآن کے باب میں ایک نہایت اہم نکتہ ہے جس سے کسی طالب قرآن کو غافل نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن پاک کے اسالیب اور کلام کی ترتیب میں جو اتنی تبدیلیاں ہوتی ہیں، اگر ہم یہ کہہ کر ان سے گزر جائیں کہ یہ محض قرآنی اعجاز کو ظاہر کرنے کے لیے ہیں، تو ہم بیش بہا قرآنی معارف کے ایک بہت بڑے حصہ سے محروم رہ جائیں گے یہاں اصولی طور پر دو باتیں سامنے رہنی چاہئیں، پہلی بات یہ ہے کہ فصاحت و بلاغت اور اعجاز بیان قرآن پاک کے اوصاف میں سے ہے، اس کے مقاصد میں سے نہیں، بھلا اس سے انکار کی کسے مجال کہ پورا قرآن پاک سرتاسر ایک معجزہ ہے، جو تمام جن و بشر کے دائرۂ قدرت سے باہر ہے، لیکن پھر بھی یہ چیز کلام الٰہی کی غایت نہیں کہی جاسکتی بلکہ اس کا ایک لازمی وصف ہے، کیونکہ یہ ایک الٰہی کلام ہے اور کوئی بھی انسان کلام الٰہی کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتا، الٰہی کلام اور انسانی کلام میں ہمیشہ زمین آسمان کا فرق ہوگا کہ یہ ایک ناقص انسان کا کلام ہے جبکہ وہ ایک سراپا کمال اور سراپا جمال ہستی کا بھیجا ہوا پیغام ہے، دوسری بات یہ کہ کلام کی ظاہری تبدیلیاں، بجائے خود معجزہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اگر وہ اپنے اندر حکمت کا کوئی اہم پہلو نہ رکھتی ہوں، ان تبدیلیوں کے اندر اعجاز کا پہلو پیدا ہی اس وجہ سے ہوا کہ اس حکیم مطلق نے اسالیب کی

ذرا ذرا سی ظاہری تبدیلیوں کے پردے میں علوم و معارف کے بیش بہا خزانے چھپا دیے ہیں، صیغوں کے اختلاف، جملوں کی تقدیم و تاخیر، الفاظ کی تعریف و تنکیر، وصل و فصل وغیرہ کی ذرا ذرا سی تبدیلیاں جو عام نگاہوں میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں، ان تبدیلیوں کی تہ میں اسرار و حکم کی اتنی تجلیاں بے تاب ہوتی ہیں جن کا ہم شمار نہیں کر سکتے، امام فراہی چونکہ کلام الٰہی سے سچا عشق رکھتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ اس علیم و حکیم ہستی کا بھیجا ہوا کلام ہے، جس کی کوئی ادا حکمت سے خالی نہیں، اسی لیے وہ ایک ایک لفظ پر غور کرتے، اس کی تہ میں اترنے کی کوشش کرتے، وہ ایک ایک اسلوب پر ٹھہرتے اور اس کی باریکیوں کو سمجھنے کی سعی کرتے، وہ کلام کی ترتیب اور اجزائے کلام کی باہمی مناسبتوں پر غور کرتے اور ان کے اندر چھپی ہوئی تجلیوں کا سراغ لگاتے، اس فصل کے اندر امام موصوف نے اجزائے کلام کی باہمی مناسبتوں پر جو گفتگو کی ہے، مطالعۂ قرآن اور تدبر قرآن کے باب میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، طلبۂ قرآن کے لیے یہ انتہائی قیمتی تحفہ ہے۔

استاذ امام نے پورے قرآن پاک کا مطالعہ اسی ڈھنگ سے کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی ساری تفاسیر میں شروع سے آخر تک یہی رنگ نظر آتا ہے، وہ کسی بھی آیت سے سرسری طور سے نہیں گزرتے، بلکہ حتی المقدور اس کے سارے گوشوں کو سامنے لاتے اور تمام محاسن کو بے نقاب کرتے ہیں۔

امام فراہی یہاں ایک اور انکشاف بھی کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ہر سورہ کا ایک عمود یا ایک مرکزی مضمون ہوا کرتا ہے، جو مطالب سورہ کے لیے شیرازہ کا کام دیتا ہے، وہ سورہ کے تمام مضامین کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے، وہ تمام بکھرے

ہوئے موتیوں کو جمع کر کے ان سے ایک خوبصورت قیمتی ہار تیار کر دیتا ہے، فہم القرآن کے باب میں یہ چیز بڑی اہمیت کی حامل ہے، عمود کا سر رشتہ جب ہاتھ آجاتا ہے تو پوری سورہ اپنی وسعت اور کثرت مضامین کے باوجود ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتی ہے، وہ شروع سے آخر تک ایک نہایت مربوط، مرتب اور بلیغ خطبہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس کے تمام مضامین باہم دگر مربوط ہوتے ہیں، ان کے درمیان کسی قسم کی بیگانگی یا بے تعلقی نہیں رہ جاتی، سورہ کے تمام اجزاء روشنی میں آجاتے ہیں اور ہر آیت کا صحیح محل متعین ہو جاتا ہے، پھر تفسیر و تاویل کے باب میں ٹھوکریں کھانے اور مختلف وادیوں میں بھٹکنے کا اندیشہ نہیں رہ جاتا، اس وقت سورہ کی مثال اس حسین گلدستہ کی سی ہوتی ہے جس کے اندر بہت سے خوشنما پھول اکٹھے ہوتے ہیں، جن کا اپنا اپنا ایک جدا حسن ہوتا ہے، مگر وہی سب پھول مل کر اپنا ایک مجموعی منظر بھی پیش کرتے ہیں، جو پہلے سے زیادہ حسین اور دلکش ہوتا ہے۔

ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے

اسی مقدمۂ تفسیر کے صفحہ ۵۵ پر استاذ امامؒ فرماتے ہیں:

"اس مقدمہ میں ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے، اور سورتوں کے مطالب میں جو بے نظمی نظر آتی ہے، وہ محض قلت تدبر کا نتیجہ ہے، یہ بات ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ قرآن کی سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی، ہر سورہ میں اگر کوئی ایک متعین مقصد نہ ہوتا جس کے پورے ہونے سے سورہ پوری ہوتی ہے، تو یہ الگ الگ

حد بندیوں کی کیا ضرورت تھی؟ پھر تو سارے قرآن کو ایک ہی سورہ بنا دیا جاتا، نیز جب سورتوں کے لیے کوئی خاص مقدار نہیں ٹھہرائی گئی، بڑی چھوٹی ہر طرح کی سورتیں ہوئیں تو اگر ہر سورہ کے اندر کوئی نظمی وحدت مدِنظر نہیں ہے تو آیتوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کیا ضرورت تھی؟ اجزاء یوں ہی بکھیر دیے جاتے، اور اگر سطر سطر کے برابر اجزاء ہوتے جب بھی کوئی مضائقہ نہ ہوتا۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آیات کا ایک مجموعہ ایک سورہ کے اندر رکھا گیا ہے اور وہ سورہ کے نام سے موسوم ہوا، گویا ایک شہر بسا کر اس کے اردگرد شہر پناہ کھینچ دی گئی، تو اب غور کرنے کی بات ہے کہ ایک ہی شہر پناہ کے اندر کئی شہر کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ یہ بھی واضح ہے کہ معانی کا تشابہ بھی ان کو ایک شہر پناہ کے اندر نہیں جمع کرتا، معوذتین (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب النّاس) باہم وگر جس قدر مشابہت رکھتی ہیں معلوم ہے، تاہم ان دونوں کو ایک سورہ نہیں قرار دیا گیا، بلکہ دونوں دو مستقل سورتیں قرار پائیں، اسی طرح سورہ تکویر، انشقاق، مرسلات، نازعات، ذاریات، سب ہم معنی سورتیں ہیں لیکن نظم اور اسلوب کلام انکے مختلف ہیں۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جب قریش قرآن کے مثل دنش سورتیں لانے سے عاجز رہے تو کم از کم ایک سورہ کے لیے مطالبہ ہوا، اس سے کم کے لیے مطالبہ نہیں ہوا، اور سورتیں چھوٹی بڑی ہر قسم کی مراد ہوئیں،

لیکن اس سے ایک سورہ کے بقدر کلام مراد نہیں ہُوا، ہمارے بعض مفسّرین جو اس نکتہ سے واقف نہ تھے، بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ قرآن نے اپنے مانند ایک سورہ کے بقدر کلام پیش کرنے کا بھی مطالبہ کیا ہے، ان کو کلام کی اتنی مقدار میں وجہ اعجاز تلاش کرنے میں زحمتیں پیش آئیں، مثلاً آیت حرّمت علیکم امّھاتکم وبناتکم (الآیۃ) سورۂ کوثر سے مقدار میں زیادہ ہے، لیکن اس سوال میں ان کو حیرانی پیش آئی کہ اس میں اعجاز کا پہلو کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ قرآن نے جو مطالبہ کیا ہے اس میں پیش نظر ایک سورہ بحیثیت مجموعی ہے، بلا شبہ کسی سورہ کی مثال پیش کرنا تمام جن و بشر کی طاقت سے باہر ہے، اگرچہ سورہ کوثر کی سی مختصر سورہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ سورہ سے اللہ تعالیٰ کی مراد ایک منظّم کلام ہے، اس میں چھوٹی اور بڑی کا امتیاز نہیں ہے، جس طرح درخت، نبات اور حیوان کے الفاظ ہیں جو اپنے تحت کے تمام چھوٹے بڑے افراد پر مشتمل ہیں، اسی طرح سورہ کا لفظ چھوٹی اور بڑی تمام سورتوں پر مشتمل ہے، بعض علماء کے اقوال سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ امام سیوطی نے اتقان میں، جعبری کا ایک قول نقل کیا ہے:

"سورہ کی حد قرآن کی اتنی مقدار ہے جو چند آیات پر مشتمل ہو، جن میں تمہید اور خاتمہ ہو، اور اس کی کم سے کم مقدار تین آیت ہے۔"

اس محقق کے نزدیک سورہ کے لیے ایک ایسی نظمی وحدت ضروری

ہے، جس میں تمہید، خاتمہ اور عمود ہو، اس لیے کم از کم تین آیتیں ایک سورہ کی تالیف کے لیے ضروری ہوئیں،،

چھوٹی سورتیں بڑی سورتوں کی ہمسر ہیں:

"مزید براں اگر تم چھوٹی سورتوں پر تدبر کرو گے تو معلوم ہو گا کہ ربط و نظام کے محاسن کے لحاظ سے وہ بھی بڑی سورتوں کی ہمسر ہیں، چھوٹی سورتوں کے اندر بھی ربط و پیوستگی کی وہ تمام نزاکتیں موجود ہیں، جو بڑی سورتوں کے اندر ہیں، اس وجہ سے یہ خیال کرنا کہ چھوٹی سورتوں، مثلاً سورہ ماعون، سورہ کوثر اور سورہ عصر وغیرہ میں بے نظمی ہے، سخت غلطی ہے، ان سورتوں کا باریک نہج اگر تمہاری سمجھ میں آجائے تو بڑی سورتوں کا نہج سمجھنے میں اس سے تمھیں بڑی مدد ملے گی، اسی طرح بڑی سورتوں کے اندر آیتوں کے ایسے مجموعے ہیں، جن کا نظم و ربط بالکل واضح ہے، صرف ایک غبی آدمی ہی ان کے سمجھنے سے قاصر رہ سکتا ہے، مثلاً سورہ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتیں اپنے نظم کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں، پس جو شخص ان میں تفکر کرتا ہے، اس میں آہستہ آہستہ ان سے زیادہ دقیق نظام سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے، قرآن کے تدبر میں میرا بھی حال ہوا اور میں یقین رکھتا ہوں کہ جو لوگ جستجو کی یہ راہ اختیار کریں گے، وہ بالآخر نظم قرآن کو پالیں گے والذین اهتدوا زادهم هدی۔"

اس فصل میں استاذ امامؒ نے ایک نہایت اہم نکتہ کا انکشاف فرمایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک کی ہر سورہ کا ایک مخصوص نظام ہے، ہر سورہ کے اندر ایک ایسی نظمی وحدت ہے جو اسے دوسری تمام سورتوں سے ممتاز کرتی اور اسے منفرد مقام عطا کرتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کے اعجاز کا اصل راز اسی نظم کے اندر پوشیدہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب حکیم میں ربط و نظام کی نزاکتوں اور لطافتوں کی جیسی رعایت کی ہے، وہ تمام انس و جن کے بس سے باہر، اور یہ جو قرآن پاک نے مشرکین کو چیلنج دیا تھا کہ تم اور تمہارے سارے الٰہ مل کر قرآن پاک کی سی کوئی ایک سورہ بھی لادو، تو وہاں سورہ سے مراد یہی منظم کلام تھا، ظاہر ہے کہ ایسا منظم کلام پیش کرنا مشرکین کے لیے تاقیامت ناممکن تھا، جن لوگوں پر یہ نکتہ منکشف نہ ہوا اور انھوں نے اسے محض الفاظ و حروف کے کسی مجموعہ پر محمول کیا، انھیں قرآن پاک کے اندر اعجاز کا پہلو دریافت کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی، وہ آخر تک اس طرح کا کوئی پہلو دریافت نہ کر سکے، جن پر خود انھیں یا دوسروں کو اطمینان ہو سکتا ہے۔

استاذ امام کا خیال ہے کہ قرآن پاک کی ہر سورہ میں خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی ایک مخصوص نظام ہے، اور ہر سورہ کا ایک متعین مقصد اور مستقل موضوع ہے، جو اسی کے ساتھ خاص ہے، اور یہ جو قرآنی سورتوں کے اندر کوئی نظم نہیں معلوم ہوتا، یا بسا اوقات ایک زائد سی تکرار معلوم ہوتی ہے، یہ دراصل ہمارے عدم تدبر

کا نتیجہ ہے، وہ نظم کے ثبوت اور اس کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے اسی مقدمۂ تفسیر میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

نظم قرآن کی سب سے بڑی شہادت

"پھر نظم قرآن کی سب سے بڑی شہادت ان لوگوں کا علم و یقین ہے، جن پر حسن ترتیب کے محاسن کچھ بے نقاب ہو گئے ہیں اور جنھوں نے ان حقائق کی کوئی تجلی دیکھ لی ہے، جو نظم قرآن کے اندر ودیعت ہیں، یہ لوگ جانتے ہیں کہ کتاب اللہ کے اسرار و عجائب کا کیسا عظیم الشان خزانہ ہے، جس کی کلید صرف نظم ہے، یہ چیز ان کے ذوق جستجو کو شہ دیتی ہے اور ان کی طمانیت و بصیرت میں اضافہ کرتی ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس مخفی خزانہ کو اجاگر کریں، اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی کو بامراد کرتا ہے، اور جتنا ان کے مقدر میں ہوتا ہے وہ اس میں سے پا جاتے ہیں، جو دروازے کھلتے جاتے ہیں، ان کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے شکرگزار ہوتے ہیں اور جو دروازے نہیں کھلتے ان کو وہ اپنی قلت علم اور نارسائی فہم پر محمول کرتے ہیں، کیونکہ معلوم ہے کہ کتاب الٰہی ایک سمندر ہے جس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے، کوئی شخص آفتاب کو اپنے احاطہ میں نہیں لے سکتا، اور نہ کوئی شخص قرآن کے معاملہ میں کبھی غلطی سے محفوظ ہو سکتا ہے، لیکن یہ چیز ان کے شوق و طلب کی سرگرمی کو کمزور نہیں کرتی، بلکہ ان کا ذوق جستجو برابر مشتعل

رہتا ہے، اور وہ اس محنت سے جتنا کچھ بھی پاتے ہیں، اس کی قدر کرتے ہیں، چنانچہ جس نے بھی اس علم میں سے کچھ حصہ پایا ہے اس نے اس نعمت عظمیٰ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ہے۔"

علامہ فراہیؒ نے اپنی تفسیر نظام القرآن میں بنیادی طور پر اسی نظم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، وہ کہتے ہیں قرآن پاک کے بارے میں اکابر امت کا جو یہ اتفاق ہے کہ وہ اسرار حکمت کا ایک لازوال خزانہ ہے یا علوم و معارف کا ایک ناپیدا کنار سمندر ہے، اس کا راز اسی نظم کے اندر پوشیدہ ہے، یہی نظم ہے جو قرآنی علوم و معارف کی کلید ہے، اور یہ کلید جب ہاتھ آجاتی ہے تو آدمی پر علوم و معارف کے ایسے ایسے دروازے کھلتے ہیں جو اس کے نشان و گمان میں بھی نہیں ہوتے، اس کو ذاتی طور پر محسوس ہونے لگتا ہے کہ واقعتہً قرآن پاک کے اسرار و حکم کی دنیا بڑی وسیع ہے، اس کی وسعت کبھی ناپی نہیں جاسکتی، یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کا نہ کوئی ساحل ہے نہ اس کے گراں بہا موتیوں کی کوئی حد ہے، یہ ایک ایسا آفتاب ہے جس کی کرنوں کا احاطہ ناممکن ہے، اس کے برعکس جو لوگ نظم قرآن کے قائل نہیں، ان کے لیے یہ باتیں نہ صرف یہ کہ عجیب ہیں، بلکہ کہنا چاہیے ناقابلِ فہم ہیں، ان کے لیے اس راز کو سمجھنا بڑا دشوار ہے کہ قرآن پاک علوم و معارف کا ایک بحر بیکراں کیسے ہے، اس لیے کہ ان کے ہاں تو قرآنی معارف کا دائرہ بہت ہی تنگ اور محدود ہے، ان کے ہاں تو سب کچھ وہی ہے جو قرآن نے صریح لفظوں میں دو ٹوک انداز سے بیان کر دیا ہے لہٰذا خود قرآن کے الفاظ جب لامحدود نہیں تو اس کے علوم کیسے لامحدود ہو سکتے ہیں، کہنے کو وہ بھی قرآن کی تعظیم میں یہ تمام باتیں

کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہیں، مگر یہ باتیں وہ عقیدت کی ہی زبان سے کہہ سکتے ہیں، بصیرت کی زبان سے نہیں۔

قرآن پاک علوم کا بحرِ بیکراں کیسے؟

بہتر ہوگا اگر ہم لگے ہاتھوں یہ گرہ بھی کھولتے چلیں کہ قرآن پاک علوم و معارف کا ایک بحرِ بیکراں کیسے ہے؟ اس لیے کہ اگر تمام لوگ نہیں تو کم از کم ہماری اکثریت کا ذہن ناصاف ہے، وہ بصیرت کی روشنی میں اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں، وہ اس طرح کی باتیں عموماً عقیدت میں کہہ دیتے ہیں، ورنہ اس سلسلہ میں وہ کوئی واضح تصور نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ علمی حیثیت سے ہم نے قرآن پاک کو وہ مقام نہیں دیا ہے جس کا وہ اہل تھا، بلکہ غلط نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ہم نے اسے علمی میدان میں پسِ پشت ڈال دیا ہے، آج وہ ہم سے اپنی مہجوری کی فریاد کر رہا ہے کہ ہم نے اس پر غور و تدبر کرنا چھوڑ دیا ہے، گویا ہم اس کے خزانۂ علم و حکمت کے قائل ہی نہ ہوں، حالانکہ اس کی تہوں میں علم و حکمت کے اتنے خزانے مدفون ہیں جن کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے، اس کو اگر تم ایک سادہ مثال سے سمجھنا چاہو تو یوں سمجھ سکتے ہو کہ عام لوگوں کے لیے ایک گلاب کے پھول میں سوائے رنگ و بُو کے کچھ نہیں ہوتا، بلکہ بہت سے پھول تو ایسے ہیں جن کے اندر رنگ و بو کا بھی احساس نہیں ہوتا، مگر کیا حقیقت یہی ہے؟ کیا ایک پھول اپنے اندر سوائے رنگ و بُو کے کچھ نہیں رکھتا؟ اگر حقیقت یہی ہے تو شہد کی مکھی انہی پتیوں اور پنکھڑیوں کو چوس چوس کر ان سے شیریں، خوش ذائقہ اور قوت بخش شہد کہاں

سے تیار کر دیتی ہے ؟ یہ دریاؤں کا پانی ہے۔ ایک عام نگاہ میں اس پانی کی قدر و قیمت اس سے زیادہ اور کیا ہے کہ وہ پینے اور کھیتوں کو سینچنے کے کام آتا ہے، کیا تجربات و مشاہدات کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے کا انسان اس سے آگے بھی کچھ سوچتا رہا ہو مگر پھر بعد کی متمدن دنیا ان ہی دریاؤں اور سمندروں کی تہہ سے موتی نکال لاتی ہے، نیز ان ہی دریاؤں کی تہوں سے وہ بجلی جیسی عظیم قوت کا انکشاف کرتی ہے، کیا پہلے کا انسان کبھی تصور کر سکتا تھا کہ اسی ٹھنڈے اور بہتے ہوئے پانی سے کبھی بجلی بھی تیار کی جائے گی اور اتنے عظیم پیمانے پر اس سے گرمی اور روشنی حاصل کی جائے گی ؟ اور کیا وہ یہ سوچ سکتا تھا کہ ان تلخ اور کھارے سمندروں کی تہوں سے ایسے قیمتی موتی بھی حاصل کیے جائیں گے ؟ ایک اور سادہ مثال لو، زمین کی مٹی پر نظر ڈالتے ہو تو تمھیں کیا نظر آتا ہے ؟ کیا اس مٹی کے اندر کوئی رنگ، کوئی بو، کوئی ذائقہ اور کوئی شیرینی محسوس کرتے ہو ؟ کیا اس میں کوئی خوبی اور دلکشی نظر آتی ہے ؟ مگر کیا حقیقت بھی یہی ہے ؟ اگر حقیقت بھی یہی ہے تو یہ رنگ برنگ پھولوں کے قافلے کہاں سے نمودار ہوتے ہیں ؟ ان کے اندر یہ حسن و جمال اور رنگ و بو کہاں سے آتا ہے ؟ یہ صہبائے خوشگوار کے پیمانہ و ساغر جنھیں تم آم، انگور، انار جیسے مختلف ناموں سے پکارتے ہو، یہ کہاں سے تیار ہوتے ہیں ؟ یہ خوش ذائقہ شربت کے گلاس کہاں سے آتے ہیں جنھیں تم مزے لے لے کر پیتے ہو ؟ پھولوں کے اندر یہ رعنائی و دلکشی اور پھلوں میں یہ چاشنی و شیرینی کہاں سے آتی ہے ؟ کیا مٹی کے علاوہ کہیں اور سے بھی آتی ہے ؟ پھر یہ سونا، چاندی اور ایسی ہی دوسری دھاتیں کس کے بطن میں پرورش پاتی ہیں ؟ غور کرو،

یہ زمین جو دیکھنے میں اس قدر بدرنگ اور بے رونق نظر آتی ہے جو بظاہر اپنے اندر کوئی لذت اور دلکشی نہیں رکھتی ہے؟ یہی زمین کیسی کیسی خوش رنگ اور خوش ذائقہ نعمتوں کے پرتکلّف دسترخوان سجاتی اور کیسے کیسے خوبصورت اور قیمتی زروجواہر کی حسین دکانیں آراستہ کردیتی ہے، بالکل یہی مثال قرآن پاک کی بھی سمجھو، وہ ایک نہایت سادہ سی کتاب ہے، مگر حقیقت میں وہ ایک ایسا اتھاہ سمندر ہے، جس کی گہرائی کبھی ناپی نہیں جاسکتی، وہ علم وحکمت کا ایسا خزانہ ہے جس کے موتی کبھی شمار نہیں کیے جاسکتے، وہ ایک ایسا آفتاب ہے، جس کی کرنیں کبھی سمیٹی نہیں جاسکتیں، وہ ایک ایسا خوان کرم ہے جس کی نعمتیں کبھی کم نہیں ہوسکتیں، وہ ایک ایسا چشمۂ حیات ہے جس کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوسکتے، وہ ایک ایسا آسمان ہے جہاں مہر وماہ کا ہجوم ہے، وہ ایک ایسا میخانہ ہے جس کے ساغر ومینا کبھی گنے نہیں جاسکتے. پینے والوں کی کتنی ہی کثرت ہو، وہاں کبھی تشنہ لبی کا شکوہ نہیں کیا جاسکتا، مختصر یہ کہ اس کتاب الٰہی کی توصیف نہیں کی جاسکتی، یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح ساتوں سمندروں کی روشنائی بھی خالق کائنات کے کرشموں کو قلمبند نہیں کرسکتی، روشنائی ختم ہوجائے اور سمندر خشک ہوجائیں، مگر اس کے کرشمے ختم نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح اس کی بھیجی ہوئی کتاب حکیم کے عجائب حکمت بھی بے شمار ہیں، نہ کبھی وہ ختم ہوسکتے اور نہ کبھی ان کا احاطہ کیا جاسکتا،

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ (لقمٰن : ۲۷)

(جتنے درخت پوری زمین پر ہیں، اگر وہ قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر ہے، اس کے علاوہ سات سمندر اور ہو جائیں (جو بطور سیاہی کے استعمال ہوں) تو بھی اللہ کے کرشمے ختم نہیں ہو سکتے۔ بے شک اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے۔)

خزانۂ حکمت کی کلید

فطری طور پر تمہارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس خزانۂ حکمت کی کلید کیا ہے؟ وہ کون سی بیٹری ہے، جو اس راہ کے نشانات کو نمایاں کرتی اور منزل مراد کی طرف رہنمائی کرتی ہے؟ وہ خضر راہ کہاں ہے جس کی معیت میں تم اس چشمۂ حیات پر پہنچ سکتے اور وہاں اپنی تشنگی دور کر سکتے ہو؟ امام فراہیؒ جو سچ مچ کتاب الٰہی کے محرم راز تھے جنھوں نے اس میخانے میں علم و حکمت کے نہ جانے کتنے جام پیے تھے، اور ان سے خوب خوب سیراب ہوئے تھے جنھوں نے مدتوں اس جنت کی سیر کی تھی اور اس کے لالہ و گل اور انار و انگور سے اپنے دامن بھر لیے تھے، ان کا کہنا ہے کہ وہ کلید، وہ بیٹری اور وہ خضر راہ صرف نظم کلام ہے، یہی وہ کلید ہے جس سے انھوں نے اس خزانۂ حکمت کا انکشاف کیا تھا، یہی وہ بیٹری ہے جس کی روشنی میں انھوں نے یہ راہ طے کی تھی اور یہی وہ خضر راہ ہے جس نے انھیں اس چشمۂ حیات پر پہنچایا تھا۔

کوہ کنی کیجیے!

یہ ضرور ہے کہ یہ راہ بہت کٹھن ہے، یہ وادی بڑی سنگلاخ ہے، ابتدا

یہاں عجز و درماندگی کے علاوہ کچھ نہیں، بس لگے رہیے، لگے رہیے، کوشش کیجیے، مگر کوششوں کا حاصل مت دیکھیے، کوہ کنی کیجیے مگر ہاتھوں کے چھالے مت گنیے، منزل کی طرف بڑھیے مگر یہ نہ پوچھئے کہ منزل کہاں ہے! یہ راہ، اتنی صبر آزما ہے کہ اگر سچی طلب اور عزم وارادہ کی مضبوطی نہ ہو تو راہ رو تھک کر بیٹھ رہتا ہے، وہ کچھ ہی دور آگے جانے کے بعد پھر پیچھے کی طرف پلٹ آتا ہے، اسی لیے اس راہ کے راہی بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں، لیکن اگر آدمی صبر و استقامت کا ثبوت دے، وہ تھک ہار کر بیٹھ نہ جائے بلکہ مسلسل لگا رہے، وہ اس راہ میں اپنی اس لاحاصلی ہی کو حاصل زیست سمجھے، تو بالآخر راہ ہموار ہو جاتی ہے، منزل قریب آجاتی ہے اور ان ہی چٹانوں کے جگر سے علم و حکمت کے چشمے ابلنے لگتے ہیں، قرآن پاک کی اس خصوصیت کو اگر ہم ادبی پیرائے میں بیان کرنا چاہیں، تو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ شاعر مشرق کے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں ؎

اگر جانت شہید جستجو نیست | زباں بینی ز سیر بوستانش
بہار او طلسم رنگ و بو نیست | نماید آنچہ ہست اندر رگ گل

جس طرح ایک باغباں پھلوں سے بے پروا ہو کر نہایت صبر کے ساتھ پودوں کی نگہداشت اور ان کی غور و پرداخت کرتا ہے، وہ اس باغ کی مٹی میں اپنا گرم گرم پسینہ شامل کرتا ہے، یہ سوچے بغیر کہ اس کا کوئی پھل اسے نصیب بھی ہوگا یا نہیں، اس کوچے میں جو قدم رکھتا ہے اسے بھی ویسی ہی عرق ریزی کرنی ہوتی ہے اور اسی صبر و استقلال کا ثبوت دینا ہوتا ہے، تم دیکھتے ہو کہ زیتون کا تیل جب کسی قندیل میں ڈال دیا جاتا ہے تو کس طرح وہ دلکش نورانی

شعاعوں میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پورے ماحول کو جگمگا کر رکھ دیتا ہے، مگر کیا تم نے یہ بھی غور کیا کہ اس روغن کو نورانی شعاعوں میں تبدیل کرنے یا اس تیل سے روشنی حاصل کرنے کے لیے اس قندیل کو کیا کچھ کرنا پڑا ہے؟ قندیل کو اس کے لیے اپنا جگر جلانا ہوتا ہے، قندیل کے اندر چھپی ہوئی بتی جو در اصل اس کی رگ جاں ہوتی ہے، وہ اس تیل میں ڈوب جاتی ہے اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو جلاتی ہے، تب جا کر اس سے وہ تیز اور دلکش روشنی نمودار ہوتی ہے جو بیاباں کی شب تاریک میں بھٹکتے ہوئے مسافروں کی رہنمائی کرتی اور انھیں منزل مقصود تک پہنچاتی ہے۔

جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

ایک طالب قرآن کی بالکل یہی کیفیت ہوتی ہے۔ اگر وہ اس سمندر سے موتی حاصل کرنا چاہتا ہے تو ساحل پر بیٹھ کر موجوں کا نظارہ کرنے یا سمندر میں اوپر ہی اوپر تیرتے رہنے سے یہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی، اگر وہ اس سمندر سے علم و حکمت کے موتی حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اسے غواصی کرنی ہوگی، وہ موجوں اور تھپیڑوں سے گزرتا ہوا اس کی تہ میں اتر جائے اور پھر دیکھے کہ وہاں بیش بہا موتیوں کے کتنے انبار لگے ہوئے ہیں، اگر وہ اس "روغن" سے نور حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ چراغ کی بتی سے سبق لے، اور اس میں ڈوب کر اپنا خون جگر جلائے، پھر وہ دیکھے کہ اس کے دل و دماغ سے نور حکمت کا کیسا سیل بے پناہ امڈ پڑتا ہے، سچ ہے ؎

جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

امام فراہی کی کچھ یہی کیفیت تھی، وہ کامل چالیس برس تک اس بحرِ حکمت میں غواصی کرتے رہے، اور اس سے اکتساب نور کے لیے اپنا خونِ جگر جلاتے رہے، اسی کا کرشمہ تھا کہ وہ اس سمندر سے ایسے ایسے انمول موتی نکال لائے، جن تک دوسروں کی رسائی نہ ہو سکی اور ان کا باطن نورِ حکمت سے پوری طرح جگمگا اٹھا، انھیں حکمت کی ایسی روشنی حاصل ہو گئی جو ہر قدم پر ان کے ساتھ رہتی اور ہر موڑ پر ان کی رہنمائی کرتی۔

علامہ فراہیؒ ایک امام اور مجدد

مختصر یہ کہ نظمِ قرآن کا انکشاف، ہر مقام پر اس کی پوری رعایت، کلامِ الٰہی سے سچی محبت، اس پر مسلسل غور و تدبر اور اس کے رموز و اسرار کی بے پناہ جستجو ان چیزوں نے مل کر امام فراہی کو فہم قرآن کے اس مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں وہ بالکل منفرد نظر آتے ہیں، انھوں نے فہم قرآن کے جو ٹھوس اور فطری اصول دریافت کیے ہیں، ہمارے تفسیری سرمائے میں جو گراں قدر اضافے کیے ہیں، اس باب میں پیش رو مفسرین سے جو فرو گذاشتیں ہوئی تھیں، ان کی جس حکمت و بصیرت کے ساتھ نشاندہی کی ہے، اس راہ میں جو کانٹے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کانٹے جس دیدہ ریزی سے انھوں نے صاف کیے ہیں، یہ ساری چیزیں بلاشبہ انھیں ایک امام اور ایک مجدد کے بلند مقام پر لا کھڑا کرتی ہیں اور ہمیں یہ اعتراف کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ چودھویں صدی ہجری کا یہ گمنام مفسر بلاشبہ پورے زمرۂ

مفسرین کا سرتاج و سرخیل تھا، اب یہ ہمارا فرض ہوگا کہ ہم اپنے درمیان انھیں وہ مقام دیں جس کے وہ صحیح معنوں میں اہل تھے، اور اپنے پیچھے جو عظیم علمی و تحقیقی سرمایہ وہ چھوڑ گئے ہیں، اس کی قدر شناسی میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں، انھیں گوشۂ گمنامی سے نکال کر منظر عام پر لائیں، اپنے رسالوں میں اُنھوں نے علم و حکمت کے جو بیش بہا موتی سمو دیے ہیں، ان سے خود بھی فائدہ اُٹھائیں اور دوسروں کو بھی توجہ دلائیں، کتاب الٰہی کی ہمارے اندر جو قدر و منزلت ہونی چاہیے، ہم اسے وہی قدر و منزلت دیں، اور اس کے فہم و تدبر کے سلسلہ میں استاذ امامؒ نے جو قیمتی اصول دریافت کیے ہیں، ان کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں ؎

جہاں ہار و یداز مشت گل او — بیا سرمایہ گیر از حاصل او
غلط کردی رہ سر منزل دوست — دمے گم شو بصحرائے دل او

بحث و تحقیق کا بُلند معیار

علاّمہ فراہی کے ہاں ایک اور خصوصیت بھی پائی جاتی ہے جو انھیں تمام مفسرین سے ممتاز کر دیتی ہے اور وہ ہے ان کا بلند معیار تحقیق، علامہ فراہیؒ کے ہاں ہمیں علم کی جو وسعت، تحقیق کی جو بلندی، فکر کی جو گہرائی اور ذہن کی جو دراکی نظر آتی ہے، وہ کسی اور کے ہاں نظر نہیں آتی، وہ چونکہ مختلف علوم سے واقف اور متعدد زبانوں کے ماہر تھے، اس لیے ہر مسئلہ میں بہت پھیل کر سوچتے، اور جس موضوع پر قلم اٹھاتے، تحقیق کا حق ادا کر دیتے۔ وہ بیک وقت

عربی، فارسی، عبرانی، یونانی اور انگریزی زبانوں پر اہل زبان کی سی قدرت رکھتے تھے، اور مطالعہ و تحقیق کے دوران ان تمام زبانوں سے پورا فائدہ اٹھاتے، جن ارباب ذوق نے علامہ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے، وہ علامہ کی بے پناہ جامعیت اور غیر معمولی تبحر علمی سے بخوبی واقف ہیں، عربی زبان پر تو ان کی قدرت کا یہ عالم تھا کہ علامہ سید سلیمان ندوی ان کو عربی کا "سوق عکاظ" فرمایا کرتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ عربی ادب خصوصاً جاہلی کلام پر علامہ فراہی کی جیسی وسیع اور گہری نظر تھی، وہ جس طرح خطبائے عرب اور شعرائے عرب کے اشعار و خطب پر حاوی تھے، ان کے خطبوں کی بلاغتوں اور اشعار کی لطافتوں کو وہ جس طرح سمجھتے اور ان سے محفوظ ہوتے تھے، اس کے لحاظ سے سید صاحب کا یہ خطاب کچھ بھی ناموزوں نہ تھا، علامہ فراہی سخن فہمی کا کیسا اعلیٰ اور پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، وہ کلام کی باریکیوں اور اشعار کی لطافتوں کو کس طرح محسوس کرتے تھے، اس کا اندازہ کرنا ہو تو علامہ کی تصنیفات بالخصوص "جمھرۃ البلاغۃ" کا مطالعہ کرو، اس کتاب کو دیکھ کر تم محسوس کروگے کہ جرجانی اور سکاکی، جو عربی بلاغت کے امام اور اساتذۂ فن مانے جاتے ہیں، علامہ فراہی کے سامنے کتنے ہلکے اور بے مایہ نظر آتے ہیں، اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ بات آگے نکل جائے گی تو یہاں ہم مثالوں کے ذریعہ سے اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے، مگر اس وقت ہمارے پیشِ نظر علامہ کی خالص ادبی شخصیت کا تعارف کرانا نہیں، بلکہ بحیثیت ایک محقق و مفسر قرآن کے ان پر گفتگو کرنی ہے، اس لیے جرجانی اور سکاکی کے بجائے بہتر ہوگا کہ مفسرین عظام سے

ان کی شخصیت کا موازنہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ علم و تحقیق اور بحث و تمحیص کے میدان میں طبقۂ مفسرین کے درمیان علامہ فراہی کا کیا مقام تھا۔

تحقیق کے چند نمونے

ہم یہاں علامہ فراہی اور دیگر مفسرین عظام کی تحقیقات کے چند نمونے پیش کرتے ہیں کہ اس سے معاملہ کی نوعیت کو سمجھنے اور صحیح رائے قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔

قرآن پاک کے اندر سورۂ "والتین" میں "تین" کی قسم کھائی گئی ہے، "تین" سے وہاں کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں صاحب کشاف علامہ زمحشری رح کی تحقیقات درج ذیل ہیں:

"تین" کے سلسلہ میں علامہ زمحشری کی تحقیق

"وتین" کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ وہ پھل دار درختوں میں ایک عجیب درخت ہوتا ہے، روایت آتی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین (انجیر) کی ایک طبق پیش کی گئی تو آپ نے اس میں سے خود کھایا اور صحابہؓ سے بھی فرمایا کہ کھاؤ! اگر میں یہ کہوں کہ کوئی میوہ جنت سے آیا ہے تو میں کہوں گا کہ وہ یہی ہے۔ اس لیے کہ جنت کے میوؤں میں گٹھلی نہیں ہوگی، اسے کھاؤ کہ یہ بواسیر کو ختم کر دیتا اور نقرس میں فائدہ مند ہوتا۔" ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے

کہ وہاں "تین" سے مراد یہی تمھارا تین (انجیر) ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ ارض مقدس کا ایک پہاڑ ہے، جسے سریانی زبان میں تینا کہا جاتا ہے، اس لیے کہ وہاں تین (انجیر) کی پیداوار ہوتی ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ تین سے مراد حلوان و ہمدان کے درمیان کے پہاڑ ہیں اس لیے کہ وہاں تین کی پیداوار ہوتی ہے، گویا پوری بات یوں ہوئی کہ قسم ہے انجیر کی سرزمین کی۔"

علّامہ قرطبیؒ کی تحقیق

"الجامع لاحکام القرآن" کے مصنّف علّامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

"ابن عباس، حسن، مجاہد، عکرمہ، ابراہیم نخعی، عطاء ابن ابی رباح، جابر بن زید، مقاتل اور کلبی فرماتے ہیں: "تین" سے مراد وہی تین ہے جو تم لوگ کھاتے ہو، اور حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو انجیر کی ایک ٹوکری ہدیۃً پیش کی گئی تو آپؐ نے فرمایا: تم لوگ کھاؤ، اور خود بھی اس میں سے تناول فرمایا، پھر فرمایا: اگر میں یہ کہوں کہ ایک پھل جنّت سے آیا ہے، تو میں کہوں گا کہ وہ پھل یہی ہے، اس لیے کہ جنّت کے پھلوں میں گٹھلی نہیں ہوگی، اسے کھاؤ کہ اس سے بواسیر ختم ہوجاتی اور نقرس میں اس سے فائدہ ہوتا ہے، ابن عباس سے یہ بھی روایت ہے کہ تین سے مراد نوح علیہ السلام کی وہ مسجد ہے جو کوہ جودی پر بنائی گئی تھی، ضحاک

کہتے ہیں کہ "تین" سے مراد مسجد حرام ہے، ابن زید کہتے ہیں کہ "تین" سے مراد مسجد دمشق ہے، قتادہ کہتے ہیں کہ "تین" سے مراد وہ پہاڑ ہے جس پر دمشق واقع ہے، محمد بن کعب کہتے ہیں "تین" سے مراد اصحاب کہف کی مسجد ہے، کعب احبار، اقتادہ، عکرمہ اور ابن زید سے یہ بھی روایت ہے کہ "تین" سے مراد دمشق ہے اور طبری نے اسی کو ترجیح دی ہے، فراء کہتے ہیں کہ میں نے شام کے ایک شخص کو کہتے ہوئے سنا کہ "تین" سے مراد حلوان اور ہمذان کے درمیان کے پہاڑ ہیں، ایک قول یہ ہے کہ وہ شام کا ایک پہاڑ ہے، جس کا نام سریانی میں طور تینا ہے، اس کا یہ نام اس لیے پڑا کہ وہاں انجیر کی پیداوار ہوتی ہے، اسی طرح ابومکین نے عکرمہ سے روایت کی ہے کہ "تین" شام کا ایک پہاڑ ہے۔"

ان سارے اقوال کو ذکر کرنے کے بعد آخر میں امام قرطبی نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ان سارے اقوال میں صحیح تر قول پہلا ہے، کیونکہ وہی اس کے حقیقی معنی ہیں اور حقیقی معنیٰ سے انحراف کے لیے کوئی دلیل چاہیے ان کا خیال ہے کہ تین کی قسم یہاں اس لیے کھائی گئی ہے کہ اسی کے پتوں سے حضرت آدمؑ نے جنت میں ستر پوشی کا کام لیا تھا۔

علامہ ابن کثیر کی تحقیق

علامہ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں؛

"اس سلسلہ میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں، ایک قول ہے کہ تین سے مراد مسجد دمشق ہے، ایک قول ہے کہ اس سے مراد خود دمشق ہے۔ ایک قول ہے کہ تین سے مراد وہ پہاڑ ہے جو دمشق کے پاس ہے، قرطبی کہتے ہیں کہ اس سے مراد اصحاب کہف کی مسجد ہے، عوفی نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد مسجد نوح ہے جو جودی پر واقع ہے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ یہ وہی تین ہے جو تم کھاتے ہو، اور کسی امام کا قول ہے کہ تین و زیتون سے مراد بیت المقدس ہے، جہاں عیسیٰ بن مریم کی بعثت ہوئی تھی۔"

علّامہ شوکانی کی تحقیق

علامہ شوکانیؒ اپنی مشہور تفسیر فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

"اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں تین سے مراد وہی تین (انجیر) ہے جسے لوگ کھاتے ہیں، یہاں تین کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ یہ وہ پھل ہے جس میں ضرر کا کوئی پہلو نہیں، اور اس کے اندر بڑی نصیحت ہے، اس لحاظ سے کہ وہ متوجہ کرتا ہے اس ذات کی طرف جس نے اسے تیار کیا اور بالکل لقمے کے بقدر بنایا ہے، بہت سے اطباءؔ کا کہنا ہے کہ انجیر جسم کے لیے سب سے زیادہ مفید پھل ہے، اس میں جتنی غذائیت ہوتی ہے، کسی پھل میں نہیں ہوتی، مفردات و مرکبات کی کتابوں میں اس کے بڑے فائدے لکھے ہوئے ہیں، ضحاک نے

کہا ہے کہ تین سے مراد مسجد حرام ہے، ابن زید نے کہا ہے کہ تین سے مراد وہ پہاڑ ہے جس پر دمشق واقع ہے عکرمہ اور کعب احبار نے کہا ہے کہ تین سے مراد دمشق ہے"

یہ سارے اقوال درج کرنے کے بعد علامہ موصوف فرماتے ہیں:
"کاش مجھے کوئی بتاتا کہ اس لفظ کے جو اصل معنی لغت میں آتے ہیں، اس سے ان ائمہ نے کیوں انحراف کیا اور کیوں اس قسم کی تفسیریں اختیار کیں جو اصل معنیٰ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں، جن کی بنا محض ایسے توہمات پر ہے جن کا نہ عقل سے کوئی تعلق ہے نہ نقل سے، اور سب سے زیادہ تعجب تو ابن جریرؒ پر ہے کہ انھوں نے آخری قول کو کیسے ترجیح دیا، حالانکہ وہ تو روایت و درایت میں اونچا مقام رکھتے ہیں، فراء نے کہا کہ میں نے ایک شخص کو کہتے ہوئے سنا کہ تین سے مراد حلوان سے ہمذان تک کے پہاڑ ہیں، میں نے کہا مان لو تم نے اس شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا تو اس سے ہوا کیا؟ لغت کے ثبوت کے لیے محض اتنی بات تو کافی نہیں، جب کہ وہ شارع علیہ السلام سے منقول ہے نہیں، محمد بن کعب نے کہا ہے کہ اس سے مراد اصحاب کہف کی مسجد ہے، ایک قول ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے، یعنی قسم ہے سرزمین تین کی، نحاس کہتے ہیں کہ نہ قرآن میں اس کی کوئی دلیل ہے، اور نہ ان کے اقوال میں اس کی کوئی دلیل ہے، جن کو اس رائے پر اصرار ہے"

لفظ تین کے سلسلہ میں یہ وہ تحقیقات ہیں جو ان اکابر مفسرین نے اپنی تفاسیر میں پیش کی ہیں، بقیہ اور جو متداول تفسیریں ہیں ان میں بھی تقریباً یہی اقوال جمع کر دیے گئے ہیں اور ان سب کا انداز بعینہٖ یہی ہے لہٰذا ان سب کو بھی انھیں تفاسیر پر قیاس کیا جا سکتا ہے، اب ان سب کے بالمقابل ہم علامہ فراہی کی وہ تحقیق نقل کرتے ہیں جو موصوف نے سورۂ "والتین" کی تفسیر میں اس لفظ کے تحت لکھی ہے، علامہ موصوف لکھتے ہیں :

علامہ فراہیؒ کی تحقیق

"یہ بات اوپر بیان ہو چکی ہے کہ مقسم بہ (وہ چیز جس کی قسم کھائی جائے) پر اس حیثیت سے غور کرنا چاہیے کہ وہ مقسم علیہ (وہ بات جس پر قسم کھائی جائے) کی دلیل ہے، اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ تمام مقامات جن کی اس سورہ میں قسم کھائی گئی ہے، اس پہلو سے باہم ایک مشترک نوعیت رکھتے ہوں، چنانچہ اگلی فصلوں میں جزاء کے وہ واقعات ہم بیان کریں گے جو ان مقامات میں پیش آئے ہیں، تم تعجب کرو گے کہ ہم نے بغیر کسی تمہید کے ان کو "مقامات" کے لفظ سے تعبیر کر دیا ہے، لیکن اس کے لیے ہمارے پاس دلائل ہیں، جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) آئندہ فصلوں میں جب جزا کے وہ واقعات بیان ہوں گے جو ان مقامات میں پیش آئے ہیں، تو ان سے معلوم ہو گا کہ تین اور

زیتوں مقامات ہی کے نام ہو سکتے ہیں، اس کے سوا کوئی اور شکل ممکن نہیں ہے۔

(۲) یہاں "تین اور زیتون" کو "طور سینین اور بلد امین" کے ساتھ لائے ہیں، یہ تعلق بھی نہایت واضح دلیل ہے کہ ان سے مراد مقامات ہی ہو سکتے ہیں۔

(۳) علاوہ بریں اہلِ عرب مقامات و آثار سے عبرت پذیری کا خاص مذاق رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ان کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے، اس وجہ سے اگر مقامات کے ذکر سے ان واقعات کو یاد دلانا مقصود ہو جو ان مقامات میں پیش آئے ہیں تو یہ بات عربوں کے مذاق کے بالکل مطابق ہو گی، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بکثرت مقامات کا ذکر ہوا ہے اور لوگوں کو ان کے احوال سنائے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَتِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآئِهَا (الاعراف، ۱۰۱)

(یہ بستیاں ہیں جن کے احوال ہم تم کو سناتے ہیں)

(۴) تورات میں بھی ایسے اشارات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مراد مقامات ہی ہیں، نویں فصل میں ہم اس کی تفصیل کریں گے۔

اس تفصیل سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ ہم نے تین اور زیتون کے معنی بدل دیے ہیں، نہیں! صرف یہ کیا ہے کہ لفظ کے معنی کے جو مختلف پہلو ہوتے ہیں، اس میں سے ایک پہلو کو اختیار

کرلیا ہے اور زبان کے معروف قواعد کے لحاظ سے جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، ہم کو ایسا کرنے کا حق حاصل ہے، اس سے وہ اختلاف بھی رفع ہو جاتا ہے جو حضرت عکرمہؓ کے دو قولوں میں نظر آتا ہے، یعنی ایک مرتبہ انھوں نے فرمایا کہ تین وزیتون سے یہی تمھارے انجیر وزیتون مراد ہیں، اور ایک مرتبہ فرمایا کہ یہ دونوں دو پہاڑوں کے نام ہیں:

اب ذیل میں ان کے متعلق ہم ضروری معلومات پیش کرتے ہیں:

"تین" ایک خاص مقام کا نام ہے، عرب اس کو اسی نام سے جانتے تھے 'تین' انجیر کو کہتے ہیں، چونکہ یہاں انجیر کی پیداوار بکثرت تھی، اس وجہ سے یہ تین ہی کے نام سے مشہور ہو گیا، عربوں میں مقامات کے نام رکھنے کا یہ طریقہ بہت رائج تھا، جس چیز کی پیداوار جہاں زیادہ ہوتی، اسی نام سے اس مقام کو موسوم کر دیتے، مثلاً غضی، شجر، نخلہ وغیرہ، یہ لفظ کے اصل معنیٰ سے نکل جانا نہیں ہے، بلکہ جس طرح مظروف بول کر ظرف مراد لیتے ہیں، اسی طرح لفظ کو اس کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے لیے خاص کر لینا ہے۔

مشہور شاعر نابغہ ذبیانی نے اپنے اشعار میں "تین" کا لفظ استعمال کیا ہے:

وهبت الريح من تلقاء ذی ارل　　　تزجی مع الليل من صرادها صرما

صهب الظلال اتين التين عن عرض یزجین غیما قلیلا ماء ہ شبما

(ہوا چلی ذی ارل پہاڑ کی جانب سے، ہنکاتی ہوئی رات میں کم پانی والے ٹھنڈے بادلوں کے ٹکڑوں کو جن کے سایے سُرخ ہیں، جو کوہ تین کے پاس سے گزرتے ہیں، یہ ایسے بادل ہیں جن میں پانی کم ہے اور ٹھنڈا ہے)

اس میں اس نے "تین" سے شمال کے ایک پہاڑ کو مراد لیا ہے، بعض نے کہا ہے کہ یہ حلوان اور ہمدان کے درمیان ہے، ابو حنیفہ دینوری کو اس رائے سے اختلاف ہے، وہ کہتا ہے کہ نابغہ بنی غطفان کا شاعر ہے اور یہ مقام بلاد غطفان سے بہت دور ہے، لیکن یہ اختلاف بالکل بے حقیقت ہے، شعراء اکثر ایسے مقامات کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے ملک و وطن سے بہت دور ہوتے ہیں، یہی نابغہ کابل اور تدمر وغیرہ کا ذکر کرتا ہے، کیا یہ مقامات بلاد غطفان سے قریب ہیں؟ اور جبل تین تو اگلوں کے قول کے مطابق کچھ ایسا دور بھی نہیں، بالکل عراق کے پڑوس میں ہے، عرب کے شعراء فرات، دجلہ، خابور، خورنق اور سدیر وغیرہ کا گھر کی چیزوں کی طرح ذکر کرتے ہیں، شاید ابو حنیفہ کو "اتین التین" کے معنی سمجھنے میں دھوکا ہوا، اس نے سمجھا کہ نابغہ بادلوں کا اپنے وطن کی طرف آنا بیان کرتا ہے، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، نابغہ صرف بادلوں کا گزرنا بیان کرتا ہے، وہ ان ٹھنڈی شمالی ہواؤں کا ذکر کرتا ہے جو سرما کے

ہلکے بادلوں کو جبل تین کے پاس ہنکائے پھرتی ہیں اور جن سے ٹھنڈک اور زیادہ بڑھ جاتی ہے عرب شمال کی طرف سے ٹھنڈی ہواؤں کے چلنے کا ذکر اکثر کرتے ہیں اور کوہ جودی توان کے ہاں سردی اور ٹھنڈک کا خاص مرکز ہے، ایک جاہلی شاعر ابو صعترہ بولانی کہتا ہے:

فما نطفة من حب مزن تقاذفت — به جنبتا الجودی واللیل مس

فلما اقرته اللصاب تنفست — شمال لاعلی ماثه فهو قارس

باطیب من فیها وما ذقت طعمه — ولکننی فیما تری العین فارس

(برف کا وہ صاف شفاف ٹھنڈا پانی جسے اندھیری رات میں جودی کے دونوں کناروں نے پھینکا ہو، پھر وہ گھاٹیوں میں آکر جمع ہو گیا ہو اور شمالی ہوا کے چلنے سے بے حد ٹھنڈا ہو گیا ہو، وہ زیادہ لذیذ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لعاب دہن سے، میں نے اس کا مزہ چکھا تو نہیں ہے، لیکن میں ان چیزوں کو جنھیں آنکھیں دیکھتی ہیں فوراً تاڑ لیتا ہوں۔)

بہر حال یہ قطعی ہے کہ نابغہ نے تین سے شمال کے کسی پہاڑ کو مراد لیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ جودی ہو، یا اس کے قریب کوئی دوسرا پہاڑ۔

جو غلطی دینوری نے نابغہ کے شعر کو سمجھنے میں کی ہے، ٹھیک وہی غلطی صاحب معجم البلدان نے ابو صعترہ کے شعر کو سمجھنے میں کی ہے، صاحب معجم البلدان کا خیال ہے کہ ابو صعترہ نے جودی

سے یمن کا کوئی مقام مراد لیا ہے، اس خیال کی بنیاد محض یہ ہے کہ شعرا اپنے وطن سے دور کے مقامات کا ذکر نہیں کرتے، حالانکہ یہ خیال غلط ہے، ہم اوپر اس خیال کی غلطی دلائل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، پھر یہ بھی معلوم ہے کہ جودی نام کا کوئی پہاڑ یمن میں نہیں ہے، اس لیے لازماً اسی جودی کو تسلیم کرنا پڑے گا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس آیت کی تاویل میں حضرت عباس سے جو قول مروی ہے اس سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی وہ مسجد ہے جو کوہ جودی پر بنی تھی، اور حضرت عکرمہ کا قول سن چکے ہو کہ تین اور زیتون دو پہاڑ ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ تین سے مراد یا تو کوہ جودی ہے یا اسی کے قریب کوئی دوسرا پہاڑ ہے تورات میں ہے کہ بنی آدم نوح علیہ السلام کے بعد اِدھر اُدھر متفرق ہوئے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کوہ جودی کے پاس پیش آیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جبل تین حضرت آدم اور ان کی ذریت کا مسکن تھا، اس قیاس کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ تورات میں ہے کہ آدم ؑ اپنے آپ کو ڈھانکنے کے لیے اپنے اوپر انجیر کی پتیاں سی لیتے تھے۔"

یہ لفظ تین کے سلسلہ میں علامہ فراہیؒ کی تحقیقات ہیں، دیگر مفسرین کی

تحقیقات پیچھے گزر چکی ہیں، اُن تحقیقات سے علامہ فراہیؒ کی اِن تحقیقات کا موازنہ کرو، دیکھو ان دونوں کے طرزِ تحریر اور اندازِ تحقیق میں کتنا نمایاں فرق ہے، دیگر مفسرین کا حال یہ ہے کہ وہ کسی لفظ یا کسی آیت کے سلسلہ میں اقوال و روایات کا انبار تو لگا دیتے ہیں، مگر ان کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو اس کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہوتی، اس کے برعکس علامہ فراہی کا یہ حال ہے کہ وہ خود تحقیق کرتے ہیں اور جب تک کسی تحقیق پر انھیں پورا اطمینان نہیں ہو جاتا اور معاملہ کے سارے پہلو تمام دلائل و قرائن کے ساتھ روشن نہیں ہو جاتے۔ اس وقت تک وہ اسے پیش ہی نہیں کرتے، دیکھو اسی لفظ "تین"، کی تحقیق میں وہ تمام متوقع اعتراضات و شبہات کے جوابات دیتے ہوئے کتنی خوش اسلوبی سے آگے بڑھتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک جو پسندیدہ اور راجح تاویل ہے اس پر مضبوط دلائل سے ذہن کو مطمئن کر دیتے ہیں، یہ صرف لفظ "تین"، کی بات نہیں، علامہ کی جو تحریر بھی دیکھو گے، اس کے اندر یہی شان تحقیق اور یہی قوت استدلال نظر آئے گی، بات کی مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں دو ایک مثالیں اور پیش کرتے ہیں۔

سورۂ تحریم میں اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین میں سے دو کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے" ان تتوبا الی اللّٰہ فقد صغت قلوبکما" یہاں "صغت"، کے کیا معنی ہیں؟ اس سلسلہ میں علامہ زمخشریؒ کی رائے ملاحظہ ہو، وہ فرماتے ہیں:

لفظ "صغو" کے سلسلہ میں زمخشری رح کی تحقیق

"فقد صغت قلوبکما" کا مطلب ہے تم دونوں کی طرف سے ایک ایسی بات ہوئی ہے جو توبہ کو واجب کرتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اخلاص و مودت کا تقاضا تھا کہ جو چیز آپ کو پسند ہو، وہ تم کو پسند ہو، اور جو چیز آپ کو ناپسند ہو وہ تم کو ناپسند ہو، مگر تمہارے دِل اپنے اس فرض سے پھر گئے، چنانچہ ابن مسعود نے اس کو "فقد زاغت" پڑھا ہے (یعنی دِل پھر گئے، یا کج ہو گئے)

علامہ شوکانی رح کی تحقیق

علامہ شوکانی "فتح القدیر" میں لکھتے ہیں:

"صغت" کے معنی ہیں منحرف ہو گئے، حق سے پھر گئے، کیونکہ انہوں نے وہ بات پسند کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناپسند تھی، یہ اشارہ ہے افشاء راز کی طرف، اور یہ معنی بھی لیے گئے ہیں کہ اگر تم اللہ کی طرف مائل ہو (تو یہی بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دِل توبہ کی طرف مائل ہی ہیں"

علامہ قرطبی رح کی تحقیق

"الجامع لاحکام القرآن" کے مصنف علامہ قرطبی رح فرماتے ہیں:

"فقد صغت قلوبکما" کے معنی ہیں منحرف ہو گئے، حق سے پھر گئے، کیونکہ وہ دونوں اس بات کی خواہشمند تھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم باندی اور شہد سے پرہیز کریں، حالانکہ آپؐ کو شہد اور عورتوں سے دلچسپی، اور ان دونوں کی یہ خواہش آپ کے لیے باعث ناگواری تھی ابن زید کہتے ہیں کہ ان دونوں کے دل کج ہو گئے، کیونکہ ان دونوں کی خواہش یہ تھی کہ آپؐ ام ولد سے اجتناب کریں، گویا ان دونوں کو وہ بات مرغوب تھی جو آپؐ کو ناگوار تھی، اور ایک قول ہے کہ تم دونوں کے دل توبہ کی طرف مائل ہیں۔"

صاحب جلالین کی تحقیق

جلالین میں ہے:

"فقد صغت قلوبکما" دل جھک گئے تحریم ماریہ کی طرف، یعنی تمہاری یہ خواہش ہوئی، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ چیز ناپسند تھی۔"

یہ چند مفسرین کی تحقیقات ہم نے بطور نمونہ لکھ دیں، انھی پر بقیہ تفاسیر کو بھی قیاس کر سکتے ہو کیونکہ بقیہ تفاسیر میں بھی کچھ تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ یہی باتیں ملیں گی، اب ان تحقیقات کے بالمقابل ہم علامہ فراہیؒ کی تحقیقات نقل کرتے ہیں، ان کے موازنہ سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے اور دیگر مفسرین کے معیار تحقیق میں کتنا نمایاں فرق ہے، اسی

آیت کے تحت علامہ فراہیؒ سورۂ تحریم میں لکھتے ہیں:

علاّمہ فراہی کی تحقیق

"دنیا کی تمام زبانوں میں عموماً اور عربی زبان میں خصوصاً خاص خاص معانی کے لیے آتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ ایک کلی معنی کے تحت بھی ہوتے ہیں، جو لوگ زبان کی ان خصوصیات سے ناواقف ہیں، وہ زبان کے فہم سے محروم رہتے ہیں، مثلاً مَیل (جھکنا، ہٹنا) ایک کلی مفہوم ہے، اس کے تحت عربی میں بہت سے الفاظ ہیں مثلاً زیغ، جور، ارعواء، حیادۃ، انحراف وغیرہ، لیکن یہ سب میل عن الشیئ، یعنی کسی چیز سے ہٹنے اور پھرنے کے لیے آتے ہیں، پھر اسی کے تحت فیئ، توبۃ، التفات، اور صغو وغیرہ الفاظ ہیں، جو سب کے سب میل الی الشیئ، یعنی کسی چیز کی طرف مائل ہونے اور جھکنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، جو لوگ اس قسم کے باریک فرقوں سے ناواقف ہیں وہ زبان کے سمجھنے میں خود بھی غلطیاں کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی غلطیوں میں ڈالتے ہیں۔

اس نکتہ کے واضح ہو جانے کے بعد عربی زبان کے ایک عالم سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی کہ صغت قلوبکما کے معنی "انابت قلوبکما و مالت الی اللہ و رسولہ" (یعنی تم دونوں

کے دِل اللہ اور اُس کے رسول ؑ کی طرف جھک چکے ہیں) کے ہوں گے، کیونکہ "صغو" کا لفظ کِسی شے کی طرف جھکنے کے لیے آتا ہے، کِسی شے سے مڑنے اور ہٹنے کے لیے نہیں آتا، لفظ کی یہ حقیقت اس کے تمام مشتقات میں موجود ہے، مثلاً "صاغیۃ الرّجل" کِسی شخص کے پیروؤں کو کہتے ہیں "صغوہ معک" کے معنی ہیں اس کا میلان تمھاری طرف ہے، "اصغیت الی فلان" اس کی طرف تم نے کان لگایا، حدیث شریف میں ہے ینفخ فی الصور فلا یسمعہٗ احد الا اصغی الیہ (صور پھونکا جائے گا تو کوئی سننے والا ایسا نہ ہوگا جو اس کی طرف اپنی گردن نہ موڑے) اسی طرح محاورہ ہے "الصبیّ اعلم بمصغی خدّہ" (بچہ اپنی آغوش مہر و محبّت کو خوب پہچانتا ہے) اسی سے ہے "صغت الشمس والنجوم" (سورج اور ستارے زمین کی طرف جھک گئے) ہرّہ (بلّی) والی حدیث میں ہے: "کان یصغی لہا الاناء" (اس کے لیے برتن کو جھکا دیتے تھے تاکہ وہ آسانی سے پانی پی سکے) برتن کے جوف کو "صغو" کہتے ہیں، کیونکہ چیز اس میں مجتمع ہو جاتی ہے۔

ابن بری نے "اصغاء سمع" (کِسی کی طرف کان لگانا) کے ثبوت میں کسی شاعر کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیا ہے:

تری السفیہ بہ عن کل مکرمۃ　　زیغ وفیہ الی السفیہ اصغاء

(نادان انسان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عزو شرف کی ہر بات سے منہ موڑتا ہے اور سفاہت کی باتوں کی طرف کان لگاتا ہے)

ذوالرمہ اونٹنی کی تعریف میں کہتا ہے:

تصغی اذا شدھا بالکور جانحۃ

حتی اذا ما استوی فی غرزھا تثب

(جب وہ اس پر کجاوہ کستا ہے تو وہ گردن موڑ کر کان لگاتی ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے رکاب میں پاؤں رکھ دیتا ہے تو وہ اچھلتی ہوئی چلتی ہے۔)

اعشیٰ اونٹنی کی آنکھ کے بارے میں کہتا ہے:

تری عینھا صغواء فی جنب مؤقھا

تراقب کفی والقطیع المحرما

(اس کی آنکھ گوشۂ چشم کی طرف جھکی ہوئی ہوتی ہے اور وہ میری ہتھیلی اور مضبوط بنے ہوئے کوڑے کو دیکھتی ہے)

نمر بن تولب "اصغاء اناء" کا محاورہ انڈیل دینے کے معنی میں استعمال کرتا ہے:

وان ابن اخت القوم مصغی اناءہ

اذا لم یزاحم خالہ باب جلد

(اور قوم کے بھانجہ کی حق تلفی کی جاتی ہے، اگر وہ اپنے ماموؤں کی ایک بہادر باپ سے مزاحمت نہ کرے۔)

میں نے یہ تمام اشعار لسان العرب سے نقل کیے ہیں اور جگہ جگہ بعض مفید اشارے بھی کر دیے ہیں، جن لوگوں کو حق کی تلاش ہے ان کے لیے یہ شواہد بس کرتے ہیں، وہ ان کو پاکر پوری طرح مطمئن ہو جائیں گے، اور گھڑنے والوں نے روایات و آثار میں جو زہر ملا دیا ہے۔ اس سے ہلاک نہ ہوں گے۔ گھڑنے والوں نے جب کتاب الٰہی میں لفظی تحریف کی راہیں بند دیکھیں تو معنوی تحریف ہی کے لیے انھوں نے کچھ دروازے کھول لیے، اور کیا لفظی تحریف کی جسارت سے یہ حضرات باز رہے ہیں؟ ابو مسعود نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ ایک قرأت زاغت کی بھی ہے، لیکن خیریت ہے کہ اس کو صیغۂ مجہول سے بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ناقابل اعتنا شخص کا قول ہے، تاہم دیکھو "صغا" کے معنی "زاغ" کے کر دینے کے لیے کیا کیا کوششیں کی گئی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ حق کو باقی رکھتا ہے اور باطل کو برابر چھانٹتا رہتا ہے۔"

کتنی عجیب بات ہے کہ یہاں بیشتر مفسرین نے "صغت" کے وہی معنی لیے ہیں جس معنی کے لیے لغت میں سرے سے گنجائش ہی نہیں، اور صحیح مفہوم کا اگر ذکر بھی کیا ہے تو آخر میں مجہول کے صیغے سے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مفہوم ان کے نزدیک لائق ترجیح یا قابل اعتنا نہیں ہے، اور جس مفہوم کو اختیار کیا ہے، اس کے لیے کوئی دلیل یا وجہ ترجیح بھی نہیں بیان کی

ہے، بس یوں ہی بغیر کسی تحقیق کے ایک ہی مفہوم کو وہ اپناتے چلے گئے ہیں، اس کے برعکس علامہ فراہی اس کے تمام استعمالات و مشتقات کو سامنے رکھتے ہوئے اس لفظ کی اصل کا سراغ لگاتے ہیں اور دلائل و شواہد کی روشنی میں اس کے صحیح مفہوم کی نشاندہی کرتے ہیں۔

واقعۂ "ذبح" کے سلسلہ میں علامہ فراہی کی تحقیق

"قرآن پاک کے اندر سورۂ صافات میں اللہ تعالیٰ نے ذبیح کا واقعہ بیان فرمایا ہے، ہمارے دین میں اس واقعہ کی کتنی اہمیت ہے، اس سے اہل نظر ناواقف نہیں، یہی واقعہ ہے جس نے واضح طور پر ابراہیمؑ و اسمٰعیل علیہما السلام کی بے لوث بندگی اور کامل سرفگندگی کو ثابت کر دیا اور پھر اسی کے نتیجہ میں انھیں بارگاہ ایزدی سے وہ عزت و سرفرازی حاصل ہوئی، جو ان سے پہلے کسی کو حاصل نہ ہو سکی، اگر یہ بات ذہن میں رہے کہ حضرت خاتم الانبیاء علیہ السلام کی بعثت اور امتِ مسلمہ کا وجود بھی دراصل ان دونوں بزرگوں کی انھی قربانیوں کا صلہ اور ان کی معصوم دعاؤں کا نتیجہ تھا، تو پھر بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عزت و سرفرازی نہ ان سے پہلے کسی کو حاصل ہو سکی اور نہ ان کے بعد کسی کو حاصل ہوئی، قربانی کا یہ عظیم الشان واقعہ حضرت اسمٰعیل اور بنی اسمٰعیل کے لیے عزت و سرفرازی کی ایسی روشن یادگار ہے کہ اس نے

ہمیشہ کے لیے انھیں ساری اقوام عالم کا امام بنا دیا، یہی وجہ ہے کہ یہود بنی اسمٰعیل کے لیے یہ شرف تسلیم کرنے کے کبھی روادار نہ ہوسکے، انھوں نے آخری کوشش صرف کر ڈالی کہ حضرت اسمٰعیل کے بجائے حضرت اسحٰق کو ذبیح ثابت کر کے عز و شرف کا یہ تاج بنی اسمٰعیل کے سر سے اتار لیں اس کے لیے انھوں نے تورات میں جگہ جگہ تحریفات بھی کر ڈالیں، تورات میں جہاں قربانی کا واقعہ بیان ہُوا ہے وہاں بالکل بے تکے طور پر حضرت اسمٰعیل کے بجائے حضرت اسحٰق کا نام ڈال دیا اور پھر متفقہ طور پر ایسے زور شور سے یہ آواز بلند کی کہ عام و خاص سب یہی بولی بولنے لگے حتیٰ کہ اس پروپیگنڈے نے ہمارے بعض ان علماء کو بھی متاثر کر دیا جو یہود سے روایات قبول کر لینے میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے تھے، اور ان کے صحیفوں کے بارے میں بڑی خوش گمانی رکھتے تھے۔

اس لحاظ سے غور کرو تو یہ واقعہ کتنا زیادہ اہم تھا اور کتنی شدید ضرورت تھی کہ اس سلسلہ میں یہود نے جتنی تحریفات کی ہیں، ان سب کا پردہ چاک کیا جائے اور مضبوط دلائل کی روشنی میں ان کے اس دعوے کی غلطی واضح کی جائے، مگر کتنی عجیب بات ہے کہ کسی نے بھی معاملہ کی نزاکت کو محسوس نہیں کیا، علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ تو یہودی پروپیگنڈے سے اس درجہ

متأثر ہو گئے کہ قرآن پاک کے واضح اشارات کے باوجود حضرت اسحٰق کے ذبیح ہونے کے قائل ہو گئے، امام رازی اور علّامہ زمخشری دونوں فریق کے دلائل بیان کر کے خاموش ہو گئے ان دلائل کی جانچ پڑتال اور ان کی تحقیق کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور نہ اپنا کوئی رجحان ظاہر کیا کہ وہ حضرت اسمٰعیل کو ذبیح مانتے ہیں یا حضرت اسحٰق کو۔

صاحب جلالین لکھتے ہیں کہ: "اسمٰعیلؑ مراد ہیں یا اسحٰقؑ، دونوں مذہب ہیں۔"

امام سیوطیؒ اپنے رسالہ "الحق الصریح فی تعیین الذبیح" میں دونوں طرح کے اقوال و روایات جمع کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"پہلے میرا خیال تھا کہ ذبیح حضرت اسحٰق علیہ السّلام ہیں، لیکن اب اس معاملہ میں مَیں نے توقف اختیار کر لیا ہے۔"

درمنثور میں بھی ان کا یہی انداز ہے، انھوں نے دونوں نظریے بغیر کسی تحقیق و ترجیح کے نقل کر دیے ہیں۔"

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہمارے علماء و مفسرین میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں جس نے اس مسئلہ کی نزاکت کو کماحقہ محسوس کیا ہو اور اس پر کوئی محققانہ گفتگو کی ہو، بلاشبہ علّامہ ابن کثیر اور کچھ دوسرے مفسرین نے حضرت اسمٰعیل کا ذبیح ہونا ثابت کیا ہے اور اس کے لیے کچھ دلائل بھی دیے ہیں مگر ان کی گفتگوئیں کچھ سرسری ہی انداز کی ہیں، انھوں نے

کوئی تحقیقی انداز نہیں اختیار کیا ہے، ہماری نگاہ میں علامہ فراہیؒ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے صحیح معنوں میں اس موضوع کو ہاتھ لگایا اور حق یہ ہے کہ تحقیق کا حق ادا کر دیا، پہلے انھوں نے تنقیدی نگاہ سے یہود کے دعووں کا جائزہ لیا، علمی انداز سے ان کی تحریفات کا پردہ چاک کیا اور خود تورات کی روشنی میں حضرت اسمٰعیلؑ کا ذبیح ہونا ثابت کیا، پھر قرآنی دلائل سے اس دعوے کو مزید مستحکم کیا، انھوں نے "الرّأی الصّحیح فیمن ھو الذّبیح" کے نام سے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا جس کا اردو ترجمہ بھی "ذبیح کون ہے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس میں انھوں نے حضرت اسمٰعیل کے ذبیح ہونے پر تیرہ دلیلیں تورات سے دی ہیں اور تیرہ دلیلیں قرآن پاک سے، پھر آخر میں لکھتے ہیں:

"اس باب کی یہ آخری بحث ہے، ہم نے مختصر لفظوں میں جامع دلائل کی طرف صرف اشارے کر دیے ہیں، اگر ہم ان مباحث میں تفصیل کا حق ادا کرتے تو دلائل کی تعداد بہت بڑھ جاتی، لیکن باب اوّل کی طرح اس میں بھی ہم نے صرف تیرہ دلیلیں بیان کیں۔"

اس کے بعد روایات اور اقوال سلف کا جائزہ لیتے ہوئے اہلِ عرب کے اقوال اور حالات قبل از اسلام سے استدلال کیا ہے۔

یہ کتاب صحیح معنوں میں علم و تحقیق کا ایک شاہکار ہے اور اپنے موضوع پر ایک بالکل ہی منفرد کتاب ہے، علامہ فراہیؒ کی ان تمام ہی تصانیف کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بحث و تحقیق کا معیار کتنا بلند تھا، ان کا

مطالعہ کس قدر وسیع اور ان کی نظر کتنی گہری تھی، اس جہت سے ہم علامہ فراہیؒ کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مفسرین کی پوری جماعت میں ہمیں کوئی بھی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جسے ہم علامہ کے مقابلہ میں پیش کر سکیں۔

تفسیر کے لیے ٹھوس بنیادیں اور متعیّن اصول

مولانا فراہیؒ کے ہاں ایک اور خصوصیت بھی پائی جاتی ہے، جو مفسرین میں کسی اور کے ہاں نظر نہیں آتی، ہمارے علم کی حد تک مفسرین کے اندر امام فراہیؒ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ قرآن پاک کی تفسیر لکھی، بلکہ تفسیر کو مستقل ایک فن کی حیثیت دی، ان سے پہلے تفسیریں تو بہت لکھی گئیں مگر اس کے باوجود تفسیر نے باقاعدہ ایک فن کی حیثیت نہیں اختیار کی تھی، قرآن پاک کی تفسیر کن بنیادوں پر کی جائے؟ تاویل و تفسیر کے کیا اصول ہوں؟ ان اصولوں کا ماخذ کیا ہو؟ ان کے درمیان ترتیب کیا ہو؟ ان میں باہم تعارض ہو تو ترجیح کس کو دی جائے؟ ایک آیت کے اندر مختلف معانی کا احتمال ہو تو صحیح مفہوم تک رسائی کیسے حاصل کی جائے؟ مختلف معانی میں کسی ایک معنی کو کیسے متعین کیا جائے؟ قرآن پاک کے مطالعہ و تفسیر کے سلسلہ میں دوسرے آسمانی صحیفوں کو سامنے رکھا جائے یا نہ رکھا جائے؟ اگر سامنے رکھا جائے تو کس حیثیت سے رکھا جائے؟ کب استفادہ کیا جائے اور کب اعراض کیا جائے؟ کہاں اعتماد کیا جائے اور کہاں

اجتناب کیا جائے؟ تفسیر بالرائے کیا ہے؟ کوئی تفسیر تفسیر بالرائے کے حکم میں کب داخل ہوگی، سلف نے اس سے منع کیوں کیا ہے؟ اس سے ان کی منشا کیا تھی؟ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں تفسیری روایات کی کیا حیثیت ہوگی؟ کن روایات کی رعایت کی جائے گی اور کن سے براءت کی جائے گی؟ تفسیر کے باب میں عربی زبان وادب کا کیا مقام ہوگا؟ خود قرآنی آیات سے کس حد تک مدد لی جائے گی؟ کن چیزوں کو اصل کی حیثیت تابع کی ہوگی، نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم اور صحابۂ کرام کا کیا انداز تھا؟ ان کے ہاں قرآن کے مطالعہ و تدبر کا کیا طریقہ تھا؟ اس طرح کے بیشتر مباحث اور متعدد عنوانات ہیں، جن کو اب تک کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا، اور اگر کسی نے ہاتھ لگایا تھا تو ضمنی طور پر بالکل سرسری انداز میں، کسی نے ان موضوعات کو اس حیثیت سے ہاتھ نہیں لگایا تھا کہ انھیں مرتب و مدون کر کے تفسیر کو مستقل ایک فن کی حیثیت دے دے۔

فن تفسیر کی تدوین

امام فراہیؒ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ان مباحث پر محققانہ گفتگو کی، اور ان کے سلسلہ میں اس طرح داد تحقیق دی کہ تفسیر نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی، انھوں نے اپنی بلند پایہ تفسیر "نظام القرآن" کے شروع میں اصول تفسیر سے متعلق "فاتحہ نظام القرآن" کے نام سے ایک رسالہ شامل کیا، جس میں تفسیر قرآن کے سلسلہ میں نہایت قیمتی اور بنیادی

اصولوں کی نشاندہی کی، پھر اصول تفسیر سے متعلق الگ سے بھی ایک گراں قدر رسالہ مدون فرمایا، جس کا نام "التکمیل فی اصول التاویل" رکھا، افسوس ہے کہ امام فراہی کا یہ رسالہ ناتمام ہی رہ گیا، لیکن تفسیر و تاویل سے متعلق اس میں بہت سی اصولی بحثیں آگئی ہیں اور امام موصوف نے اس میں اتنا وافر مواد اکٹھا کر دیا ہے کہ اس کو بنیاد بنا کر اب اس فن پر بہت کچھ کام کیا جاسکتا ہے، انھوں نے اس راہ کے سارے بنیادی خطوط نمایاں کر کے منزل بالکل سامنے کر دی ہے، اور اب اگر کوئی یہ راہ طے کرنی چاہے تو اس کیلیے کسی قسم کی دشواری نہیں رہ گئی ہے، قرآن فہمی کے سلسلہ میں ان کے ہاں ربط و نظام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، ان کے نزدیک قرآن پاک کی تمام سورتیں اور ساری آیتیں ربط و نظام کے سنہری تاروں سے بندھی ہوئی ہیں، ہر آیت اپنے پہلے اور بعد کی آیات سے اور ہر سورہ اپنے ماقبل و مابعد سورہ سے گہرا تعلق رکھتی ہے، اور ان کے اس باہمی ربط و تعلق کا سراغ لگانا ایک طالب قرآن کے لیے انتہائی ناگزیر ہے، اس اصول کی اہمیت کے پیش نظر انھوں نے اس پر الگ سے ایک نہایت نفیس رسالہ لکھا، جس کا نام "دلائل النظام" رکھا، اور اس میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

دیگر علوم پر عبور

پھر نہ صرف یہ کہ اصول تفسیر پر گراں قدر کتابیں لکھیں اور اسے ایک

نہایت اہم اور مستقل فن کی حیثیت دی، بلکہ قرآن سے تعلق رکھنے والے جتنے دوسرے علوم تھے، ان سب کا براہِ راست گہرا مطالعہ کیا اور تنقیدی نگاہ سے ان سب کا جائزہ لیا، جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ علوم مختلف پہلوؤں سے تشنہ ہیں، ان کے اندر گوناگوں خامیاں اور کمزوریاں ہیں، یہ ابھی خاصی توجہ اور اصلاح و ترمیم کے محتاج ہیں، کچھ تو اصلاح و ترمیم کے محتاج ہیں اور کچھ اس لائق ہیں کہ از سرِ نو مدوّن کیے جائیں، پچھلی عمارتوں کو منہدم کر کے از سرِ نو ان کی تعمیر کی جائے، چنانچہ "فاتحہ نظام القرآن" میں ان علوم کے سلسلہ میں ان کے یہ تاثرات سامنے آتے ہیں۔

کُتب لغت کی نوعیّت

باقی رہے دوسرے الفاظ (جو شرعی اصطلاحات سے تعلق نہیں رکھتے) اور حقیقت و مجاز کے مختلف اسلوب، تو اس باب میں ماخذ قدیم کلام عرب اور خود قرآن مجید ہے، لغت کی کتابیں ان چیزوں کی تحقیق میں کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کرتیں، ان سے بالعموم نہ تو الفاظ کی پوری حقیقت معلوم ہوتی ہے، نہ عربی خالص اور عربی مولد کے درمیان کوئی امتیاز ہوتا ہے، اور نہ لفظ کی اصل کا ہی پتہ لگتا ہے کہ معلوم ہو سکے کیا اصل ہے کیا فرع، کیا حقیقت ہے کیا مجاز ؟ تو جو لوگ کلام عرب میں مہارت نہیں بہم پہنچاتے بلکہ صرف لغت کی کتابوں پر قانع ہو جاتے ہیں، وہ بسا اوقات

قرآن مجید کے معانی سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں، پھر قدیم کلام عرب کا جتنا حصہ ہم تک پہنچا ہے اس میں بہت کچھ ملاوٹ بھی ہے، اور غریب و نامانوس الفاظ کی بھی اس میں آمیزش ہے، لیکن ایک ناقد ماہر کے لیے اصل و نقل میں امتیاز کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے، پس ضروری ہے کہ تفسیر قرآن میں صرف وہ معنی لیے جائیں جو اصل کلام عرب سے ماخوذ ہوں، مزید برآں شاذ معنی ہرگز نہ لیے جائیں، مثلاً بعض لوگوں نے آیت وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (الآیۃ) میں تمنی کے معنی تلاوت کرنے کے لیے ہیں اس طرح کے غیر ثابت اور شاذ معنی کی طرف جو لوگ گئے ہیں محض بعض اشکالات سے بچنے کے لیے گئے ہیں، حالانکہ یہ بجائے خود ایک بہت بڑا فتنہ ہے، اور اس سے امت میں اختلاف کا دروازہ کھلتا ہے، جو شخص اصل راہ کو چھوڑ کر چلے گا، اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھائے۔

فن نحو کی کیفیت

اس کے علاوہ جو دوسرے علوم زبان ہیں، مثلاً نحو، منطق، اصول بیان، بلاغت، قافیہ، تو ان پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، اپنے فوائد کی کثرت کے باوجود فہم قرآن کے نقطۂ نظر سے لغت کی کتابوں

سے بھی زیادہ کوتاہ ہیں، موجودہ فن نحو بہت کچھ اضافے کا محتاج ہے، یہ تو صرف متوسط درجہ کے کلام کے لیے اصول فراہم کرتا ہے، اس وجہ سے مفسر کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ کلام الٰہی کو موجودہ اصول نحو پر بہت زیادہ منطبق کرنے کی کوشش کرے، اس طرح کی کوشش کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کو کلام الٰہی میں ایسی ترمیم و تاویل کرنی پڑے گی جس سے ایک دیکھنے والے کو یہ گمان ہوگا کہ قرآن مجید زبان کی عام شاہراہ سے بالکل ہٹا ہوا ہے، بلکہ اس کو کلام عرب سے وہ شہادتیں فراہم کرنی چاہئیں جن سے یہ ثابت ہو کہ قرآن ہی کا اسلوب زبان کا بلند ترین معیاری اسلوب ہے۔''

منطق کا حال

''منطق ہیں تمام تر مدار تحدید اور نفی و استثناء وغیرہ کے الفاظ کے استعمال ہیں موشگافی اور ایک لگے بندھے طرز استدلال کی پابندی پر ہے، اس لیے عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

(اللہ نے آدم کو سارے نام سکھا دیے)

اور وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ

(اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ ان کو اگلوں نے جھٹلا دیا)

وغیرہ اسالیب کو سمجھنا اس کے لیے دشوار ہے اور قرآنی

دلائل وبراہین اس کی گرفت سے باہر ہیں، ہم اس کے متعلق ایک دوسرے مقدمہ میں مفصّل گفتگو کریں گے ؛"

عِلم البیان کا حال

"عِلم البیان کا حال بالکل نحو جیسا ہے، جو کلام ایک زندہ قلب کے اندر سے ابلتا ہے یہ علم اس کی خوبیوں کو بھی واضح کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، تو آسمان وحی سے برسنے والا کلام اس کی تنگنائے میں کیا سما سکے گا؟ صاحب وحی بلکہ ہر داعئ حق کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب حالات تقاضا کرتے ہیں، اس کے قلب کے اندر سے ایک چشمہ ابلتا ہے، وہ کبھی مجاز کے رنگ میں گفتگو کرتا ہے، کبھی حقیقت کے بھیس میں، لیکن ہر صُورت میں وہ اپنی مخاطب جماعت کے فہم اور اپنی زبان کے طریقوں کی رعایت کرتا ہے، وہ باپ اور بیٹے کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اپنے جسم کو مختلف جسموں میں بانٹتا ہے، اپنا گوشت و خون دوسروں کو کھلاتا ہے، ید، ساق، وجہ، عرش، کرسی وغیرہ کلمات اپنی گفتگو میں لاتا ہے، لبسط وقبض الطی ونشر، حسرت و انتقام اور غضب ومحبّت وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے، اور اس کے مخاطب ان کو بے تکلّف سمجھتے ہیں، البتّہ جو شخص عِلم بیان کی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ لے گا، وہ چیونٹی کی طرح

چلے گا اور اندھوں کے مانند ٹھوکریں کھائے گا، زبور اور صحف انبیاء کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ آسمانی کلام میں مجاز کو کس قدر دخل ہوا کرتا ہے۔"

اصُول فقہ کا حال

"فن اصول فقہ کے متعلق ہم ان لوگوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں، جنھوں نے اس کی بنا ڈالی، بلاشبہ یہ فن ایک ایسا فن ہے جس کو انھوں نے یونانیوں، ہندوستانیوں یا کسی اور قوم سے نہیں لیا ہے، بلکہ ضرورت داعی ہوئی کہ یہ ایسے اصول بنائیں جو کتاب و سُنّت سے احکام کے استنباط کے لیے ضابطہ کا کام دیں، پس اس فن کے بلاشبہ یہ لوگ بانی اور اس میں دوسروں کے امام ہیں، لیکن اس بات کا نہایت افسوس ہے کہ بعد والوں کو اس کی تدوین و ترتیب کی توفیق نہیں ہوئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا پورا نظام کمزور اور پھسپھسا رہ گیا، اور وہ ربط و نظم اس میں نہیں پیدا ہو سکا کہ اس کو فن کا نام دیا جا سکے، یہی وجہ ہے کہ اس میں اختلافات بہت ہیں۔ جو بالآخر احکام اور قوانین کے اختلاف کا سبب ہوئے، نحو اور منطق وغیرہ کا یہ حال نہیں ہے، یہاں شدید ضرورت سے ہم نے اس فن سے متعلق یہ چند سطریں لکھی ہیں، اس سے زیادہ کی یہاں گنجائش نہیں، شاید اللہ تعالیٰ

مجھے اس فن کو مرتب کرنے کی توفیق بخشے۔"

فن بلاغت کا حال

"فن بلاغت کو لوگوں نے صرف اشعار سے مستنبط کیا ہے اور اشعار کا دائرہ معلوم ہے کہ وہ صرف در و بست کی خوبیوں، الفاظ کی رعنائیوں اور بدیع کی صنعت کاریوں تک محدود ہے، باقی رہے حسن استدلال کے گوناگوں پہلو، ربط معانی کے مختلف انداز، ضرب الامثال کے مختلف طریقے، قصص سے عبرت پذیری کے مختلف ڈھنگ، کلام کا بڑھ کر اپنے مرکز کی طرف لوٹنا زجر اور عتاب، متکلم کی شدت یقین کا اظہار، مترفعانہ اعراض، ناصحانہ اظہار حسرت وغیرہ جن کی مثالیں صرف خطباء کے کلام اور انبیاء علیہم السلام کی وحی میں مل سکتی ہیں، ہمارے فن بلاغت نے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے، خطبائے عرب کا کلام ان لوگوں کو زیادہ یاد نہیں اور خطبائے عجم کے کلام پر انھوں نے غور نہیں کیا، چنانچہ باقلانی رح نے باوجودیکہ بلاغت قرآن کو بے نقاب کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر ڈالا ہے، لیکن استناد کے لیے تمام تر صرف اشعار پر اعتماد کیا ہے، خطبات کے صرف تھوڑے سے نمونے دے دیے ہیں، تاکہ مقابلہ کر کے تم خود کچھ فرق معلوم کر لو، باقی رہے وہ دس امور، جن کی طرف ہم نے اوپر

اشارہ کیا ہے، جن میں سے پانچ عقلی ہیں اور پانچ نفسی، تو ان کا کوئی ذکر باقلانیؒ نے نہیں کیا ہے، یہ امور ایسے نہیں ہیں، جو کسی ایک ہی زبان کے ساتھ مخصوص ہوں، بلکہ تمام زبانوں میں عام ہیں، اس لیے کلام عرب سے ان پر شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے صرف اشارہ کر دینا کافی ہے، قرآن مجید خود ان کے اوپر دلیل ہے۔

پھر موجودہ علم بلاغت اسالیب کلام کی معرفت کے لیے بھی تشفی بخش رہنمائی اپنے اندر نہیں رکھتا، اس فن کے مصنفین عموماً عجمی ہیں اور اہل عجم کے لیے عرب کے انداز و اسالیب پر غور کرنا اور ان کو سمجھنا نہایت مشکل ہے، پس بجائے اس کے کہ ان کی کوتاہیوں اور نارسائیوں کی شکایت کی جائے جو تھوڑی بہت خدمت انھوں نے اس فن کی انجام دی ہے اس پر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، یہ کیا کم ہے کہ بعض جگہ ان کا تیر نشانہ پر لگا ہے، اور بعض جگہ اگر نشانہ پر نہیں لگا ہے تو اس کے قریب پہنچا ہے، اپنا مقصد واضح کرنے کے لیے میں ایک علیحدہ مقدمہ میں بعض ایسے اسالیب کا ذکر کروں گا جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں اسی طرح توالی قرآن اور اس کے کلمات کی ہم آہنگی کے متعلق بھی علیحدہ گفتگو کروں گا۔"

مذکورہ بالا اقتباسات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امام فراہیؒ

ان تمام علوم میں کیسی مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے، بلاشبہ وہ ان تمام علوم میں رب البیت کی حیثیت رکھتے تھے، وہ صحیح معنوں میں ان فنون کے مزاج شناس اور ان کے رمز آشنا تھے، وہ ان کے اندرون و بیرون اور ان کی مقتضیات و مطالبات سے پوری طرح باخبر تھے، اسی لیے انھوں نے ان کے حسن و قبح اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کو پوری طرح محسوس کیا، اور ان کی اصلاح و تہذیب اور تدوین و ترتیب کی طرف توجہ کی۔

فن بلاغت کی تدوین

انھوں نے فن بلاغت پر ایک بہت ہی محققانہ کتاب لکھی، جس کا نام "جمہرۃ البلاغۃ" رکھا، اس میں وضاحت سے یہ بات ثابت کی آج کل کا علم بلاغت جو سکاکی اور جرجانی کی کتابوں میں ملتا ہے، دراصل یونانیوں سے ماخوذ ہے، یہ اصلاً ارسطو کا وضع کردہ ہے، جسے ہمارے علماء نے جوں کا توں اپنا لیا ہے، جب کہ یہ ہماری کچھ بھی ضرورت نہیں پوری کرتا، یہ عربی ادب کی لطافتوں بالخصوص کلام الٰہی کی حکمتوں اور خوبیوں کو سمجھنے میں ذرا بھی معاون ثابت نہیں ہوتا، یہ نہ صرف یہ کہ کلام الٰہی کی لطافتوں اور حکمتوں کو سمجھنے میں مدد نہیں دیتا، بلکہ ایک طالب قرآن کو قرآنی بلاغت کی شاہراہ سے دور کر دیتا اور قرآنی اسالیب سے اس کے اندر بیگانگی پیدا کر دیتا ہے، ساتھ ہی استاذ امامؒ نے فصحائے عرب کے کلام کی روشنی میں بلاغت کے وہ اصول بھی مقرر کیے جو قرآنی بلاغت کو سمجھنے کی

صلاحیت پیدا کرتے اور قرآنی اعجاز کے گوناگوں پہلوؤں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، افسوس ہے کہ اس کتاب کے کچھ مباحث ناتمام ہی رہ گئے، امام موصوف اپنی زندگی میں ان کی تکمیل نہ فرما سکے، لیکن پھر بھی یہ اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے اور ایک عاقل کے لیے اس میں پوری روشنی موجود ہے۔

اسالیبُ القرآن

پھر قرآنی اسالیب پر بھی امام فراہیؒ نے مستقل ایک رسالہ لکھا جس کا نام "اسالیب القرآن" رکھا اس رسالہ میں استاذ امامؒ نے قرآنی اسالیب کے محاسن اور ان کی بلاغتوں سے بحث کی، اور بہت ہی مدلل طریقے سے مثالوں کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ قرآن پاک میں اسالیب کی ذرا ذرا سی تبدیلیاں اپنے اندر کتنی معنویت رکھتی ہیں، اور وہ ایک طالب قرآن کو، جو غور و فکر کا عادی ہوتا ہے، کس طرح علم و حکمت کی ایک وسیع دنیا میں پہنچا دیتی اور اسرار و معارف کے موتیوں سے مالا مال کر دیتی ہیں، یہ کتاب بھی گرچہ ناتمام ہے لیکن "کوزہ میں دریا" کی مصداق ہے۔

مفرداتُ القرآن

استاذ امامؒ نے لغت پر بھی ایک کتاب لکھی، جس کا نام مفردات القرآن رکھا، اس میں ۷۷ قرآنی الفاظ کی تحقیق و تشریح کی، عربی اشعار اور قرآنی

استعمالات کو سامنے رکھتے ہوئے الفاظ کی اصل کا سراغ لگایا، ان کی رُوح کو سمجھنے اور باریکیوں کو دریافت کرنے کی کوشش کی، عام اہل لغت کی طرح محض کسی لفظ کے بہت سے معانی جمع کر دینے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ان بہت سے معانی میں جو صحیح تر اور قریب تر معنی تھے، ان کو متعین اور مدلّل کیا، اس کے علاوہ کتاب شروع میں الفاظ و لغات سے متعلق کچھ اصولی بحثیں بھی کیں، جو الفاظ کی تشریح و تحقیق کے سلسلہ میں اپنے اندر بڑی قیمتی رہنمائیاں رکھتی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کی تحقیق کس انداز سے ہونی چاہیے اور تحقیق کے کیا اصول ہمارے پیش نظر رہنے چاہئیں، انھوں نے الفاظ کی تحقیق کرتے ہوئے یہ بھی ثابت کیا کہ قرآن پورا کا پورا عربی مبین میں نازل ہوا ہے، وہ شروع سے آخر تک فصاحت و بلاغت کا ایک حسین گلدستہ اور حسن و لطافت کا ایک دلآویز مرقع ہے، ساتھ ہی امام موصوف نے ان لوگوں کے نظریہ کی تردید بھی کی جو کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں کچھ غریب اور شاذ الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں، جن سے اکابر صحابہ حتیٰ کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے ماہرین زبان اور اساتذۂ قرآن بھی آخر تک ناواقف رہے، علامہ فراہیؒ کی دیگر تصنیفات کی طرح مفردات بھی اپنے موضوع پر ایک بالکل ہی نرالی اور نہایت قیمتی کتاب ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب بھی ناتمام رہ گئی علامہ فراہیؒ اپنی زندگی میں اس کی تکمیل نہیں فرما سکے۔

حجج القرآن

اسی طرح امام فراہیؒ نے حجج القرآن کے نام سے ایک نہایت گران قدر کتاب لکھی جس میں تفصیل سے یہ وضاحت کی کہ قرآن پاک کا طرز استدلال کیا ہے، وہ جب کسی بات کو ثابت کرنا چاہتا ہے یا کسی حقیقت کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہے تو مخاطب کی طبیعت اور اس کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے کس طرح اس کی فطرت کو اپیل کرتا ہے، وہ کس طرح صاف ستھری اور فطری دلیلوں کے ذریعہ مخاطب سے قریب ہوتا ہے، اور کس طرح کانوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا اور کانوں سے گزر کر دل کے نہاں خانوں میں اپنے لیے جگہ پیدا کر لیتا ہے، ساتھ ہی اس کتاب سے مروجہ فن منطق اور علم کلام کی خامیاں اور کمزوریاں بھی آشکارا ہو جاتی ہیں اور یہ احساس ہوتا ہے کہ منطقی اور کلامی طرز استدلال بالکل ہی بودا اور غیر فطری ہے، جو ذہنوں کو تھکا تو سکتا ہے مگر انھیں مطمئن نہیں کر سکتا، نیز چونکہ یہ طرز استدلال قرآن کے فطری طرز استدلال سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، اسی لیے ایک منطقی کے لیے قرآنی اسالیب کو سمجھنا اور اس کے دلائل کو پرکھنا، ان کی قدر و قیمت کو پہچاننا اور ان سے یقین و اطمینان حاصل کرنا ممکن نہیں رہ جاتا، افسوس ہے کہ استاذ امام کی یہ تصنیف بھی تشنۂ تکمیل ہی رہ گئی اور ہنوز زیور طباعت سے بھی آراستہ نہ ہو سکی، مگر جن لوگوں کو اس کا مسودہ دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ بس دیکھنے اور مطالعہ

کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ع
ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

نقشہ ناتمام رہ گیا

اصول فقہ کے سلسلہ میں بھی استاذ امامؒ کا ارادہ تھا کہ اس کی تکمیل وتدوین کریں اور اسے باقاعدہ ایک مرتبہ فن کی شکل دے دیں، جیسا کہ خود انھوں نے اوپر اپنی یہ خواہش ظاہر کی ہے مگر افسوس کہ وہ اپنی یہ خواہش پوری نہ کر سکے، اس فن سے متعلق ان کے مسودات میں صرف چند اصولی بحثیں ملتی ہیں، جو اگرچہ بعض نہایت اہم گتھیوں کو سلجھاتی ہیں، لیکن وہ اس کمی کو پورا نہیں کرتیں جس کی طرف استاذ امامؒ نے اشارہ فرمایا ہے۔

فن نحو کو بھی امام فراہیؒ از سر نو مرتب کر کے قرآن پاک کی شاہراہ پر لانا چاہتے تھے، چنانچہ "النحو الجدید" کے نام سے ایک رسالہ لکھنا شروع بھی کر دیا تھا، مگر افسوس کہ زندگی نے ساتھ نہ دیا اور وہ چند فصلوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔

اس طرح قرآن پاک سے دور و نزدیک کا تعلق رکھنے والے جتنے بھی فنون ہیں، امام فراہیؒ ان پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور وہ اس بات کے آرزومند تھے کہ ان فنون کے اندر جو عجمی اثرات ہیں، ان اثرات کو دھو کر انھیں پوری طرح قرآن پاک سے ہم آہنگ کر دیا جائے، چنانچہ اسی کے پیشِ نظر وہ ان سارے متعلقہ علوم کی تجدید اور ان کی از سرِ نو تدوین کا ایک وسیع پروگرام اپنے سامنے رکھتے تھے، مگر ظاہر ہے وہ عمرِ نوح لے کر تو آئے

نہیں تھے، اڑسٹھ سال کی مختصر مدت میں اکیلے کیا کیا کرتے، جبکہ ان کا انداز تصنیف بھی اوروں سے مختلف تھا، ان کے اندر تصنیف وتالیف اور جمع وتدوین سے زیادہ بحث وتمحیص اور تحقیق وتدقین کا ذوق تھا، ان کا طریقہ یہ نہ تھا کہ کسی ایک موضوع کو ہاتھ میں لیں اور اس سے متعلق اب تک جو کچھ لکھا یا کہا گیا ہے، اسے جمع کردیں، بلکہ وہ ایک ناقد جوہری کی طرح ایک ایک دھات کو پرکھتے اور پیتل سے کُندن کو ممیز کرتے، وہ آنکھ بند کرکے پچھلی لکیروں پر چلتے رہنے کے عادی نہ تھے، بلکہ غلط لکیریں مٹا کر صحیح لکیریں کھینچنے کے خوگر تھے، اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ اس مختصر سی عمر میں انھوں نے تنہا اتنا کام کردیا کہ کوئی بڑی اکیڈمی بھی اس مدت میں اتنا کام نہیں کرسکتی پھر جہاں تک ہماری نظر جاتی ہے، تصنیف وتالیف کے میدان کا یہ پہلا شہسوار ہے جس کی پہلی اور آخری آرزو یہ تھی کہ قرآن پاک کو بزم علم کا صدر نشین بنایا جائے، مسلمانوں کے ہاں جتنے بھی علوم ہیں ان سب کا مرکز ومنبع کتاب الٰہی کو قرار دیا جائے، اسی کی روشنی میں از سر نو سارے علوم مدون کیے جائیں وہ علوم وفنون کی ایک ایسی دنیا بسانا چاہتے تھے جس کے سارے سیارے اسی آفتاب قرآن کے گرد گردش کرتے ہوں، ظاہر ہے یہ کوئی آسان کام نہ تھا، مگر حق یہ ہے کہ اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے یہ صحیح ہے کہ ان کے پیش نظر جو خاکہ تھا، اس کی تکمیل نہ کرسکے، انھوں نے کام کا جو نقشہ بنایا تھا، اس میں وہ پوری طرح رنگ نہ بھر سکے، مگر یہ تو انھوں نے ثابت کردیا کہ یہی کام کرنے کا ہے جواب تک کیا نہیں

گیا اور یہ کوئی ایسا کام نہیں جو کیا نہ جا سکتا ہو اور اگر اب بھی امت نے اس سلسلہ میں مزید تغافل برتا تو اس کے پاس اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کے لیے کوئی عذر نہ ہوگا۔

سفر سے پہلے راہ ہموار کر لی

غالباً میں اصل گفتگو سے کچھ دور نکل آیا، بات یہ چل رہی تھی کہ امام فراہیؒ نے نہ صرف یہ کہ قرآن پاک کی تفسیر کے لیے ایک صاف ستھری اور واضح شاہراہ بھی نکالی، انھوں نے تفسیر کو باقاعدہ ایک مستقل فن کی حیثیت دی، مکمل چالیس سال تک قرآن پاک کا بہت ہی باریک بینی سے مطالعہ کیا، اس پر تدبر و تفکر کیا، قدیم آسمانی صحیفوں کا بغور مطالعہ کیا، ایک ماہر، باریک بین اور دقیقہ رس جوہری کی طرح صحیح اور غلط، کنکر اور مرمر، کوئلے اور کندن، ہیرے اور ٹھیکرے میں امتیاز کیا، تحریفات کے تودہ میں حقائق کے جو شذرات الذہب تھے، ان کو چن چن کر اکٹھا کیا، دور جاہلیت اور عہد اسلام کا جو زر خالص یا غیر منحول عربی کلام تھا، اس پر پورا عبور حاصل کیا اور ایک وسیع النظر اور نکتہ رس استاذ فن کی طرح اسے اچھی طرح جانچا پرکھا، ذخیرۂ احادیث کو کھنگالا اور اسے ہضم کیا، اس میں تفقہ اور بصیرت حاصل کی اور قرآن و حدیث کا تقابلی مطالعہ کیا، انتھی عرق ریزیوں اور جانفشانیوں کے بعد ان سارے مراجع اور مآخذ کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن حکیم کے فہم و تدبر اور آیات الٰہی کی تفسیر و تاویل کے لیے باقاعدہ اصول

منفرد ہیے، کلام الٰہی کے تحقیق و مطالعہ کے لیے نہایت ٹھوس بنیادیں فراہم کیں، اس کے بعد قرآن پاک کی تفسیر لکھی اور اس تفسیر میں ان اصولوں کو عملاً برت کر دکھایا، ہر موقع پر ان کی پوری رعایت کی، پھر چونکہ وہ کچھ متعین اصولوں کی روشنی میں آیات کی تفسیر کرتے ہیں، اس لیے کہیں تردد و تذبذب کا شکار نہیں ہوتے، وہ پورے شرح صدر کے ساتھ آیات کی تفسیر کرتے ہیں اور شروع سے آخر تک یقین و اطمینان کی کیفیات سے سرشار نظر آتے ہیں۔

اصول کی قندیل

چونکہ انھوں نے اپنے اس سفر کے لیے ایک واضح شاہراہ اپنالی ہے اور کچھ اصولوں کی روشنی میں یہ سفر طے کرتے ہیں، اصولوں کی یہ قندیل ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی ہے، کبھی ایک لمحہ کے لیے ان سے جدا نہیں ہوتی، اس لیے ان کے قدم کہیں بھٹکتے یا لڑکھڑاتے نہیں، ان کی باتوں میں کہیں اختلاف و اضطراب نہیں پایا جاتا، ان کے استدلال میں کہیں بے ربطی یا بیگانگی نہیں محسوس ہوتی، ان کی تحقیقات میں کہیں کمزوری یا رکاکت نہیں نظر آتی، دیگر تفاسیر کا حال اس سے مختلف ہے، وہ جگہ جگہ حیرانی و سرگشتگی اور بے یقینی کا شکار نظر آتی ہیں، اختلاف و اضطراب، کمزوری و رکاکت اور بے ربطی و بیگانگی کی وہ خامیاں ان کے ہاں پائی جاتی ہیں جو کسی بھی تفسیر قرآن میں نہیں پائی جانی چاہییں اور جن سے بحمد اللہ امام فراہیؒ کی تفاسیر خالی ہیں، اپنے اس

احساس کی تائید یا اس دعویٰ کے ثبوت میں ہم متعدد مثالیں پیش کر سکتے ہیں، مگر یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، اس لیے اختصار کے پیشِ نظر صرف ایک مثال پر ہی اکتفا کریں گے، اُمید ہے اس ایک مثال سے ہی ہماری بات پوری طرح واضح ہو جائے گی:

قرآن کی قسمیں

قرآن پاک میں متعدد مواقع پر قسمیں کھائی گئی ہیں، عام لوگوں کو یہ الجھن پیش آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ قسمیں کیوں کھائی ہیں، جب کہ:

۱۔ قسم فی نفسہ اللہ تعالیٰ کی شان و عظمت کے بالکل خلاف ہے، اپنی بات پر قسم وہ کھاتا ہے جو اپنی ذات کو حقیر سمجھتا ہے، اور جس کو اطمینان نہیں ہوتا کہ لوگ اس کی بات تسلیم کریں گے۔

۲۔ قرآن مجید میں قسمیں نہایت اہم امور پر کھائی گئی ہیں، مثلاً قیامت، توحید، رسالت اور ہر شخص سمجھتا ہے کہ ان امور میں قسم کھانا بالکل لاحاصل ہے، نہ اس سے مخالف کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ موافق کو، مخالف دلیل و حجت کا طالب ہوتا ہے اور قسم کو دلیل و حجت سے کوئی تعلق نہیں، اور موافق کسی چیز کا بھی طالب نہیں ہوتا، وہ پہلے ہی سے ان حقائق پر ایمان لا چکا ہے جن پر یہ قسمیں کھائی گئی ہیں۔

۳۔ قسم ایسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو عظیم الشان اور بلند رتبہ ہو، پھر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بات کیسے مناسب ہو گی کہ وہ اپنی مخلوقات کی قسم کھائے

اور وہ بھی انجیر اور زیتون جیسی چیزوں کی ؟

یہ تین الجھنیں ہیں جو قسموں کے سلسلہ میں عام طور پر پیش آتی ہیں، یہ الجھنیں دور کرنے کی مختلف لوگوں نے سعی کی ہے، لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ ان سب پر فرداً فرداً گفتگو کی جائے، اس لیے بطور مثال ہم امام رازیؒ کا انتخاب کر لیتے ہیں کہ وہ اپنی وسعت وعظمت اور جلالت قدر کے لحاظ سے مفسرین کے درمیان نہایت اونچا مقام رکھتے ہیں اور ان پر جو گفتگو ہوگی، وہ بقیہ ارباب تفسیر کے بارے میں بھی اندازہ کرنے میں مدد دے گی۔

امام رازیؒ کے افکار

امام رازیؒ دوسری خلش کا ذکر کر کے سورۂ "والصافات" کی تفسیر میں اس کا جواب یوں دیتے ہیں۔

"جواب کے مختلف پہلو ہیں ایک پہلو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری سورتوں میں نہایت یقینی دلائل سے توحید، بعث اور قیامت کو ثابت کر دیا ہے، چونکہ یہ دلائل گذر چکے ہیں اور ان کا بیان ابھی ذہنوں سے اوجھل نہیں ہوا ہے، اس لیے دلائل سے قطع نظر کر کے بطور تاکید قسم کا ذکر کیا، یہاں یہ بات بھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ قرآن عربی زبان میں اترا ہے، اور کسی دعوے کو قسم کے ذریعہ ثابت کرنا اہل عرب کا عام دستور ہے مختصر سے پہلے چونکہ دلائل بیان ہو چکے ہوتے ہیں، اس لیے اصل اعتماد ان دلائل پر ہوتا ہے نہ کہ قسم پر

قسم محض تاکید کے لیے ہوتی ہے، جیسا کہ عربوں کی عادت ہے، جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنے قول "اِنَّ اِلٰھَکُمْ لَوَاحِدٌ" (بے شک تمہارا الٰہ ایک ہی ہے) کی صحت پر ان چیزوں کی قسم کھائی پھر اس کے بعد وہ بات بیان کی جو اللہ کے ایک ہونے کی یقینی دلیل ہے، یعنی رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (آسمانوں اور زمین اور ان کے مابین کا رب ہے اور مطالع کا رب ہے) تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لَوْ کَانَ فِیْھِمَا اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا (اگر آسمان و زمین میں ایک الٰہ حقیقی کے بجائے بہت سے الٰہ ہوتے تو ان دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا) میں یہ بات بیان فرما دی ہے کہ آسمان و زمین کا نظام قائم رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ایک ہے، پس یہاں جب فرمایا: "اِنَّ اِلٰھَکُمْ لَوَاحِدٌ" تو اس کے بعد ہی فرمایا: رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ، گویا پوری بات یوں ہوئی کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس عالم کے نظام پر غور کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ ایک ہے۔ پس اس دلیل پر غور کرو تاکہ تمھیں توحید کا علم حاصل ہو، جواب کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس کلام سے مقصود بُت پرستوں کے اس قول کی تردید ہے کہ یہ بُت خدا ہیں، پس اس کی تردید میں گویا یوں کہا گیا کہ یہ مذہب اپنی رکاکت اور لغویت کے اعتبار سے ایسا ناقابل توجہ ہے کہ اس کی تردید

کے لیے بس اسی طرح کی دلیل کافی ہے واللہ اعلم"۔

اس کے علاوہ سورۂ ذاریات کی تفسیر میں بھی اُنھوں نے ان شبہات سے کسی قدر تعرض کیا ہے، فرماتے ہیں:

"قسم کی حکمت دراں حالیکہ وہ نہایت اہم اور عظیم الشان مسائل ہیں۔

تفسیر سورۂ "والصافات" میں ہم بیان کر چکے ہیں اور یہاں بھی ہم اسے بیان کیے دیتے ہیں۔ اس میں چند پہلو ہیں، پہلا یہ کہ کفار بعض اوقات یہ اعتراف کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دلائل دینے میں ان سے زیادہ زوردار ہیں، لیکن اس زور کو وہ آپ کی قوتِ مناظرہ کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اپنی باتوں کی غلطیاں خود آپ پر عیاں ہیں، لیکن محض اپنی قوتِ استدلال کے زور سے، نہ کہ سچائی کے زور سے ہم پر غالب آجاتے ہیں، یہ بالکل اسی طرح کی بات تھی جیسی کہ عام طور پر گفتگو میں شکست کھاجانے والے اپنے فریقِ مقابل کے بارے میں کہا کرتے ہیں کہ یہ شخص محض اپنے زورِ بیان اور قوتِ استدلال سے ہم پر غالب آگیا اور ہم میں یہ قوّت نہیں، ورنہ وہ خود واقف ہے کہ حق ہمارے ساتھ ہے، ایسی صورت میں دلیل قائم کرنے والے کے لیے قسم کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہ جاتی، وہ جواب دیتا ہے کہ حق بات وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں، میں تم سے کوئی مناظرہ نہیں کر رہا ہوں، اگر وہ یہ طریقہ نہ اختیار کرے،

بلکہ دوسری دلیل دینی شروع کر دے تو اس دلیل کے بعد بھی وہ یہی کہے گا کہ یہ دلیل بھی محض قوت استدلال کا کرشمہ ہے، پس خاموشی یا قسم اور ترک دلیل کا طریقہ ہی اس صورت میں کچھ کارگر ہو سکتا ہے، دوسرا پہلو یہ کہ عرب جھوٹی قسموں سے پرہیز کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ جھوٹی قسمیں مصیبتیں لاتی اور آبادیوں کو ویرانوں میں تبدیل کر دیتی ہیں، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی کثرت سے نہایت ہی اعلیٰ و اشرف چیزوں کی قسمیں کھائیں اور آپ کی بلندی اور استحکام میں اضافہ ہی ہوتا گیا، اس سے ان پر یہ بات منکشف ہوتی کہ آپ کی یہ قسمیں جھوٹی نہیں ہیں ورنہ آپ ان کی آفتوں اور تباہ کاریوں سے کبھی نہ بچ سکتے، تیسرا پہلو یہ ہے کہ تمام قسمیں جو اللہ تعالیٰ نے کھائی ہیں وہ دراصل دلائل ہیں جو قسموں کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں، اس کو مثال سے یوں سمجھو کہ جیسے کوئی شخص اپنے محسن سے کہے کہ تمھارے بے شمار احسانات کے حق کی قسم میں تمھارا شکر گزار ہوں، اس میں اس کے بے پایاں انعامات کا ذکر دوام شکر کا سبب ہے، البتہ اسلوب قسم کا ہے، یہی صورت یہاں ہے (سورۂ ذاریات کی قسموں کی طرف اشارہ ہے) یہ تمام چیزیں اس بات پر دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کر سکتا ہے، رہی یہ بات کہ اس کو قسم کی صورت میں کیوں پیش کیا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جب اپنی بات قسم سے شروع کرتا ہے تو مخاطب کو خیال ہوتا ہے کہ یہ

کوئی اہم بات کہنے والا ہے اور اس کو خاص اہتمام سے سنتا ہے، پس اسی اصول پر یہاں بھی کلام کا آغاز قسم سے ہوا، اور دلیل قسم کے لباس میں پیش کی گئی۔"

پھر امام رازیؒ سورۂ والتین کی قسموں پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہاں ایک اہم اشکال یہ ہے کہ انجیر اور زیتون کا شمار بلند اور اشرف چیزوں میں نہیں ہے، پس اللہ تعالیٰ کے لیے کیسے زیبا ہے کہ وہ ان چیزوں کی قسم کھائے، اس سوال کے جواب میں دو قول ہیں:"

اس کے بعد امام رازیؒ نے تین اور زیتون کے عام معنی فرض کر کے انجیر وزیتون کے فوائد پر تقریر کی ہے اس کے بعد اس مفروضے پر کہ ان سے دو مسجدیں یا دو مخصوص مقام مراد ہیں، ان دو مسجدوں اور مقامات کے عظمت و تقدس کو واضح کیا ہے۔

تذبذب کی کیفیت

یہ قسموں کے سلسلہ میں امام رازیؒ کے خیالات ہیں جو ان کی تفسیر میں ملتے ہیں، ان اقتباسات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن پاک کی قسموں کے سلسلہ میں امام رازیؒ کا ذہن صاف نہیں ہے، ان کے خیالات میں الجھاؤ ہے، وہ اس مسئلہ میں تذبذب کا شکار ہیں، اسی لیے ان کے قدم کسی بات پر جمتے نہیں، وہ کہیں کچھ کہتے ہیں اور کہیں کچھ، بلکہ ایک ہی مقام پر وہ لبسا اوقات بالکل ہی بے ربط باتیں کہہ جاتے ہیں، ان اقتباسات کو سامنے رکھ کر بتاؤ،

کیا قسموں کے باب میں ان کا کوئی واضح فکر تمھارے سامنے آیا؟ کہیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ قسمیں استدلال کے لیے نہیں ہوتیں، بلکہ سابقہ دلائل کی تاکید کے لیے ہوتی ہیں، قسموں سے پہلے چونکہ دلائل بیان ہو چکے ہوتے ہیں، اس لیے اصل اعتماد ان دلائل پر ہوتا ہے، نہ کہ قسموں پر، کہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ تمام قسمیں جو اللہ تعالیٰ نے کھائی ہیں، وہ دراصل دلائل ہیں جو قسموں کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں، کہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ قسمیں کھا کر بت پرستوں کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ تمھاری یہ بت پرستی اس قدر لغو اور بے بنیاد شے ہے کہ اس کے لیے بس اسی قسم کی دلیل کافی ہے، گویا قسم دلیل تو ہوتی ہے، مگر پھسپھسی اور کمزور ہوتی ہے اور محض دفع الوقتی کے لیے ہوتی ہے، کہیں وہ یہ فرماتے ہیں کہ اہل عرب جھوٹی قسموں کے وبال سے ڈرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ جھوٹی قسمیں کھا کر کوئی ان کی تباہ کاریوں سے بچ نہیں سکتا، اس طرح قرآن میں قسمیں کھا کر انھیں یہ احساس دلایا گیا کہ دیکھو یہ نبی سچے ہیں، اسی لیے وہ پھل پھول رہے ہیں اور ان کی دعوت ہر طرف پھیل رہی ہے، اگر کہیں وہ جھوٹے ہوتے تو خود تمھارے عقیدے کے مطابق کب کے تباہ ہو چکے ہوتے، اور ان کے چمن میں خاک اڑ رہی ہوتی، کہیں وہ یہ فرماتے ہیں کہ قسم کا مقصد مقسم بہ کی عظمت و جلالت قدر کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے، جیسا کہ سورۂ ذاریات کی تفسیر میں اس کی صراحت کی ہے، اور سورۂ تین کی قسموں کی تاویل بھی اسی اصول پر کی ہے۔

امام رازیؒ نے قسموں کی جو توجیہات کی ہیں، یہاں ان توجیہات پر

کوئی تبصرہ کرنا ہمارے پیشِ نظر نہیں، ہم تو یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ دورانِ تفسیر امام رازیؒ کے سامنے کچھ متعین اصول اور مستحکم بنیادیں نہیں رہیں، اسی لیے انھیں اس تحیر و اضطراب کا شکار ہونا پڑا۔

امام فراہیؒ کا اطمینان و استحکام

اس کے برعکس امام فراہی کے سامنے چونکہ کچھ ٹھوس بنیادیں تھیں، کچھ متعین اصول تھے، راستے کے سارے خطوط روشن اور تمام نشانات واضح تھے، اس لیے وہ کہیں تحیر اور اضطراب کا شکار نہیں ہوتے، انھوں نے اس سفر کی جتنی منزلیں بھی طے کیں اور اس راہ میں جتنے قدم بھی وہ چلے، فہم و بصیرت کی روشنی میں چلے اور ہمیشہ یقین و اطمینان اور شرح صدر کی کیفیات سے سرشار رہے، ان قرآنی قسموں کو ہی لے لو قسموں کے سلسلہ میں ایک تو عام مفسرین کا نقطۂ نظر ہے، جس کی نمائندگی امام رازیؒ کے مذکورہ اقتباسات سے ہوتی ہے دوسری امام فراہیؒ کا نقطۂ نظر ہے، جس کی وضاحت انھوں نے اپنی بلند پایہ تصنیف "امعان فی اقسام القرآن" میں کی ہے، انھوں نے نہایت ٹھوس دلائل کی روشنی میں پورے جزم و یقین کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی قسمیں آئیں، استدلال و استشہاد کے لیے آئی ہیں، وہ دراصل فطری دلیلیں اور تاریخی شہادتیں ہیں، جو قسموں کی صورت میں پیش کی گئی ہیں اور استدلال و استشہاد کا یہ اسلوب یوں ہی محض تنوع کی خاطر نہیں اپنایا گیا ہے، بلکہ اس میں بڑی بلاغتیں اور گوناگوں حکمتیں ہوتی

ہیں، جو کسی دوسرے اسلوب میں نہیں پائی جاتیں، قرآن پاک کی قسموں کے سلسلہ میں امام فراہیؒ کا یہ مستقل نظریہ ہے جو اپنے رسالہ "امعان فی اقسام القرآن" میں قرآنی دلائل، لسانی شواہد اور ناقابل تردید تاریخی حقائق کی روشنی میں نہایت تفصیل سے ثابت کیا ہے، اور پھر تفسیر لکھتے وقت جہاں کہیں قسموں پر گفتگو کی ہے، اسی جہت سے کی ہے اور اسی اصول پر ساری قسموں کی تفسیر کی ہے، ان کا یہ اصول اور یہ نظریہ شروع سے آخر تک برقرار رہا، کہیں بھی نظر انداز نہیں ہونے پایا ہے۔

سورۂ مرسلات کی قسمیں

مثال کے طور پر وہ سورۂ مرسلات کی قسموں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم اپنے رسالہ 'امعان فی اقسام القرآن' میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ قسمیں مقسم علیہ پر دلیل و شہادت ہیں، پس یہاں بھی ان ہواؤں کا ذکر اسی مقصد سے ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بیان میں ان کے مختلف پہلو آشکارا کیے گئے ہیں، وہ چھوڑ دی جاتی ہیں، تیز و تند ہو جاتی ہیں، بادلوں کو لاد کر لاتی ہیں، نباتات کو اگاتی ہیں، حیوانات کی پرورش کا سامان کرتی ہیں۔

پھر ہر سرزمین کے ساتھ ان کا معاملہ یکساں نہیں ہوتا، اس میں فرق و اختلاف ہوتا ہے کہیں پانی برساتی ہیں تو کہیں خشک

بنجر چھوڑ جاتی ہیں، ایک قوم کو اپنی زرخیزیوں اور شادابیوں کی دولت سے مالا مال کر دیتی ہیں، دوسری کو اپنے سیلاب، اولوں اور بگولوں، کڑک اور دمک کی آفتوں سے تباہ کر دیتی ہیں۔

یہ سب حالتیں اور خصوصیتیں اس لیے بیان کی گئی ہیں کہ واضح ہو کہ ان کی باگ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اس کی قدرت و حکمت ان پر پورا تصرف رکھتی ہے، وہ اپنی عام حالت میں خدا کی رحمت کے لیے پیام بشارت ہیں، لیکن جب وہ چاہتا ہے ان کے ذریعہ ایک ظالم قوم کو ہلاک و برباد کر دیتا ہے، اور دوسری مظلوم لیکن صالح قوم کو ساحل نجات پہنچا دیتا ہے، کبھی ان کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے اور کبھی کھینچ لیتا ہے۔

یہ تمام باتیں سورۂ ذاریات کی تفسیر میں ہم بیان کر آئے ہیں اور قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اس قدر توضیح و تفصیل کے ساتھ ان کو دہرایا ہے کہ یہاں دلائل نقل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

ان ہی ظاہری احوال و آثار پر قرآن نے ایک عظیم الشان حقیقت کی بنیاد رکھ دی ہے، یعنی دنیا میں ہواؤں کے جو تصرفات ہم دیکھتے ہیں اور ان سے رحمت و عذاب اور نفع و نقصان کے جو مظاہرے ہمارے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں، ان ہی سے ایک روز جزا کے وقوع پر دلیل قائم کی ہے، کیونکہ قانون جزا و سزا کی اتنی نشانیاں اور دلیلیں ان کے اندر نمایاں ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا،

یہ خدا کی پروردگاری، اس کی قدرت، اس کی حکمت اور اس کی تدبیر کی گواہی دیتی ہیں اور واضح کرتی ہیں کہ وہ اپنے بندوں سے غافل نہیں ہے، بلکہ اس کے انعام کی بخششیں اور اس کے عذاب کے تازیانے آئے دن ان کے لیے نمودار ہوتے رہتے ہیں، پس جب یہ سب کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے یہ عجائب روز دیکھ رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک ایسا دن نہ آئے جس میں ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ ملے۔

یہ جزا و سزا کے وقوع پر بنیادی دلیل ہے اور اپنی جگہ پر پوری طرح کفایت کرتی ہے لیکن معاملہ کی ایک خاص حالت مقتضی ہوئی کہ اس کی یہاں کچھ زیادہ وضاحت کی جائے۔

کفار اپنی شدت غفلت کے باعث روز جزا کے دو وجہوں سے منکر تھے، ایک اس کے عجیب و غریب ہونے کی وجہ سے، دوسرے اس کی تاخیر کی وجہ سے، وہ کہتے تھے کہ ہم بہت دنوں سے اس کی آمد کی دھمکیاں سُن رہے ہیں، لیکن وہ آتی نہیں، پس موقع مقتضی ہوا کہ کلام کا اسلوب ایسا ہو کہ ان دونوں شبہات کا آپ سے آپ جواب نکل آئے۔

چنانچہ پہلے شبہہ کو یہاں یوں دُور کیا کہ روز قیامت کی جو تفصیلات بیان فرمائیں، وہ تمام تر ایسی ہیں جو ہواؤں کے فعل سے مشابہت رکھتی ہیں، مثلاً ہوائیں نشانات کو مٹا دیتی ہیں، آثار کو دبا دیتی

ہیں، بادلوں کو اڑا لے جاتی ہیں اور بسا اوقات تیز ہو جاتی ہیں تو ان کے زور سے دیواریں ڈھ جاتی ہیں، چھتیں اڑ جاتی ہیں، عالی شان عمارتیں پارہ پارہ ہو جاتی ہیں۔

یہ ہمارے آئے دن کے مشاہدات ہیں، لیکن ابھی ان کو دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں نہیں کھلی ہیں، قرآن مجید نے ان کی طرف اسی مقصد سے اشارہ کیا ہے کہ جو شخص ان کو سمجھ جائے گا، وہ ایک ایسے دن کے ظہور کے متعلق شبہہ میں نہیں رہ سکتا جس دن ستارے چھپ جائیں گے، آسمان کھل جائیں گے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، کیوں کہ ہواؤں کے عجائب تصرفات میں ان کی نشانیاں موجود ہیں اور پوری طرح واضح ہیں۔

دوسرا شبہہ ایک عام شبہہ تھا، اس وجہ سے قرآن مجید نے اس کا مختلف مواقع پر مختلف پیرایوں میں جواب دیا ہے، مثلاً۔

سورہ "تین" کی قسمیں

سورہ "والتین" کی تفسیر میں استاذ امامؒ لکھتے ہیں:

"اس سورہ پر غور کرنے والے کو پہلی ہی نگاہ میں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا عمود (مرکزی مضمون) اثبات جزا ہے، یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے اعمال کے مطابق جزا و سزا دے گا، اس کا آغاز قسم سے ہوتا ہے اور ہم اپنی کتاب

"امعان فی اقسام القرآن" میں نہایت تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ ان قسموں کی ایک خاص نوعیت ہے، ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس بات پر قسم کھائی گئی ہے اس پر ان چیزوں کو جن کی قسم کھائی گئی ہے بطور شہادت پیش کیا جائے، عام قسموں کی طرح ان میں مقسم بہ (جس چیز کی قسم کھائی جائے) کی تعظیم نہیں مقصود ہوتی۔

اس سورہ میں چار شہادتیں پیش کی ہیں اور یہ چاروں شہادتیں جزا کے ایسے واقعات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جو اس دنیا میں پیش آئے ہیں، تاکہ لوگ سوچیں کہ خدا تعالیٰ بندوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے، بلکہ وہ برابر عدل و انصاف کے ساتھ لوگوں کو بدلہ دیتا رہتا ہے، ان واقعات سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ قیامت میں خدا تعالیٰ ضرور بدلہ دے گا، جب دنیا میں جزا کی ایسی ایسی نمایاں مثالیں موجود ہیں تو آخرت میں اس کے واقع ہونے پر کیسے شبہہ کیا جا سکتا ہے؟"

سورۂ "والشمس" کی قسمیں

سورۂ "والشمس" کی تفسیر میں استاذ امامؒ لکھتے ہیں:

"ان آیات کے باہمی نظم پر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ اس سورہ میں پندرہ آیتیں ہیں اور ان سب میں خدا کے قانون جزا و سزا کی شہادت ہے، ابتدائی دس آیتیں عام دلائل فطرت میں سے

ہیں اور بقیہ پانچ مسلم تاریخی شہادتیں ہیں اور یہ اسلوب قرآن مجید میں عام طور پر پاؤ گے کہ تاریخی دلائل کے پہلو بہ پہلو فطری دلائل بھی بیان ہوتے اور ان کا اندازِ بیان کبھی قسم کا ہوتا ہے، کبھی غیر قسم کا، اور یہ بات ہم اپنی کتاب "امعان فی اقسام القرآن" میں بیان کر چکے ہیں کہ قسم کا مقصد دلائل بیان کرنا ہوتا ہے۔

قسم کے اسلوب پر دلائل فطرت کے بیان اور پھر ان کے بعد تاریخی شہادتوں کے ذکر کی مثال سورۂ فجر میں ملتی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے فجر کی دس راتوں کی، جفت اور طاق کی اور شب کی (جب کہ وہ ڈھل جائے) گواہیاں پیش کی ہیں، اس کے بعد دنیا کی بعض سرکش قوموں مثلاً عاد، ثمود اور فرعون کے حالات و واقعات بطور شہادت سنائے ہیں، یہی انداز سورۃ "والذاریات" میں بھی ہے، پہلے دلائل فطرت بیان ہوئے ہیں، اس کے بعد قوم لوط، قوم فرعون، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم نوح کی سرگزشتوں کو تاریخی شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اور متعدد سورتوں میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، قرآن میں یہ اسلوب عام ہے، البتہ اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ آفتاب و ماہتاب، رات اور دن اور زمین و آسمان کی گواہی یہاں کس چیز پر پیش کی ہے اور اس کے پہلو کیا کیا ہیں؟۔

یہ تین مثالیں ہوئیں، ورنہ جہاں کہیں بھی علامہ فراہیؒ نے قرآنی قسموں

پر گفتگو کی ہے، اسی جہت سے کی ہے، ان کا یہ نقطۂ نظر کہیں بھی بدلنے نہیں پایا ہے، وہ امام رازیؒ یا دیگر مفسرین کی طرح کہیں بھی تذبذب اور بے اطمینانی کا شکار نہیں ہونے پائے ہیں، پھر یہ صورتِ حال صرف قرآنی قسموں کے ہی باب میں نہیں، دیگر تفاسیر سے تفاسیر فراہی کا موازنہ کرو، تو جگہ جگہ یہی کیفیت نظر آئے گی اور اس وقت صحیح معنوں میں امام فراہیؒ کی اس خصوصیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

ذہن کی تربیت اور قرآنی ذوق کی پرورش

امام فراہی کے ہاں ہمیں ایک اور خصوصیت نظر آتی ہے جو انہیں تمام مفسرین سے ممتاز کر دیتی ہے اور وہ ہے ان کا خاص انداز تفسیر، ان کا انداز تفسیر سارے مفسرین سے بالکل جدا ہے، اور وہ اپنے اندر ایک انفرادی شان رکھتا ہے، مولانا کی تفاسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک قاری کے اندر قرآن پاک کا ذوق پیدا کرتی ہیں، وہ قرآن پاک سے شغف بھی پیدا کرتی ہیں اور قرآن فہمی کا سلیقہ بھی سکھاتی ہیں، ایک شخص خواہ وہ بالکل بتندی ہی کیوں نہ ہو اور اس راہ میں پہلا ہی قدم کیوں نہ رکھ رہا ہو اگر وہ مولانا کی تفاسیر کا غور سے مطالعہ کرے تو ایک طرف اس کا سینہ قرآن پاک کی عظمت و احترام کے جذبے سے معمور ہو جاتا ہے، اسے قرآن پاک سے غیر معمولی عقیدت اور ایک قلبی وابستگی محسوس ہونے لگتی ہے، ایک عجیب و غریب لذّت اور کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے، دوسری طرف اس کی ذہنی تربیت بھی

ہوتی ہے، اس کے اندر براہِ راست قرآن پاک کا مطالعہ کرنے، اس کی آیات پر غور کرنے اور اس کی گتھیوں کو سلجھانے کی استعداد پیدا ہونے لگتی ہے، یہ تفسیریں قرآن پاک کے رموز و اسرار اور اس کے معانی و مطالب کی طرف رہنمائی بھی کرتی ہیں اور اس راہ کے خطوط اور نشانات کو بھی نمایاں کرتی جاتی ہیں، تاکہ راہ رواں نشانات کی مدد سے خود آگے بڑھ سکے اور قدم قدم پر اسے تفاسیر کی محتاجی نہ رہے، اس کے اندر خود قرآن فہمی کا ملکہ پیدا ہو جائے، وہ کلام الٰہی کا مزاج شناس ہو جائے اور بہت سے اقوال اور بہت سی رایوں کے درمیان سے راجح قول اور صحیح رائے کا انتخاب کر لے، بہت سے اقوال سامنے آجائیں تو وہ تردد و اضطراب اور حیرانی کا شکار نہ ہو جائے، پھر یہ تفاسیر ذہن کے اندر اتنی وسعت اور ایسا ذوق جستجو پیدا کر دیتی ہیں کہ ایک طالب قرآن، قرآن پاک کے صرف ظاہری معانی و مطالب پر اکتفا نہیں کر سکتا بلکہ ان سے آگے بڑھ کر ان کی تہ میں جو اسرار و حکمت کی بجلیاں پوشیدہ ہوتی ہیں، ان کا بھی سراغ لگاتا ہے، یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو مولاناؒ کی تفاسیر کے علاوہ اور کہیں نہیں پاؤ گے۔

قدیم تفاسیر سے استفادہ آسان نہیں

دیگر تمام تفاسیر کا حال یہ ہے کہ وہ قرآن پاک کے ظاہری معانی و مطالب کے سمجھنے میں تو کسی حد تک معاون ہوتی ہیں، مگر ایک طالب قرآن کے اندر وہ قرآن فہمی کا ذوق نہیں پیدا کرتیں، پھر ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان سے کوئی

منتہی ہی فائدہ اٹھاسکتا ہے، جو اپنے اندر اتنی صلاحیت بہم پہنچا چکا ہو کہ وہ مختلف اور متضاد رایوں کے درمیان سے صحیح رائے کو ممیز کرسکے جس کے ہاتھ میں پہلے سے کوئی کسوٹی موجود ہو جس کے ذریعہ وہ کھرے کھوٹے میں امتیاز کرسکے، جو اتنا تجربہ کار اور صاحب بصیرت ہو کہ اگر اسے بیچ چوراہے پر لے جاکر کھڑا کر دیا جائے تو وہ بآسانی اپنی منزل کی طرف جانے والی سڑک کا تعین کرسکے مختصر یہ کہ جو صاحب نظر اہل علم ہیں وہی ان تفاسیر سے استفادہ کرسکتے ہیں، رہے وہ لوگ جو بندی ہیں، جو پہلے سے اپنے ہاتھ میں کوئی قندیل نہیں رکھتے، جو ابھی نئے نئے اس کوچہ میں قدم رکھ رہے ہیں اور پہلے سے اپنے اندر اتنی صلاحیت اور بصیرت نہیں رکھتے کہ اگر انھیں بیچ چوراہے پر لے جاکر کھڑا کر دیا جائے تو وہ یہ تمیز کرسکیں کہ کون سا راستہ منزل سے قریب کرنے والا اور کون سا راستہ اس سے دور کرنے والا ہے، ایسے بندیوں کے لیے یہ تفاسیر نہ صرف یہ کہ اپنے اندر کوئی رہنمائی نہیں رکھتیں، بلکہ انھیں اور زیادہ حیرانی و سرگشتگی میں مبتلا کر دیتی ہیں، اپنی بات کی مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں ایک مثال سے مدد لیں گے:

سورۂ فجر کی قسمیں

قرآن پاک میں سورہ فجر کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ وَالشَّفْعُ وَالْوَتْرِ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ،
هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِذِىْ حِجْرٍ ه

"قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت وطاق کی اور رات کی جب وہ نفوذ کر جائے، کیوں؟ اس میں تو شہادت ہے عقل والے کے لیے؟"

یہاں فجر سے، دس راتوں سے اور جفت وطاق سے کیا مراد ہے؟ اور رات سے کون سی رات مراد ہے؟ یہ چند سوالات ہیں اور جب تک ان سوالات کے صحیح جوابات کا سراغ نہ لگا لیا جائے، اس سورہ کو پورے طور پر سمجھنا اور اس کے صحیح رُخ کا تعین کرنا دشوار ہے، مفسرین اس گرہ کو کس طرح کھولتے ہیں، یا اس گرہ کو کھولنے میں وہ کس حد تک ہماری رہنمائی کرتے ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہم بطور مثال تفسیر قرطبی کو سامنے رکھتے ہیں، امام قرطبیؒ اپنی عظیم تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" کی آخری جلد میں ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے اہل تاویل کی مختلف رائیں نقل کرتے ہیں، معاملہ کی صحیح صورت حال کا اندازہ کرنے کے لیے ان چاروں چیزوں سے متعلق امام موصوف نے جو اقوال جمع کیے ہیں، انھیں ہم نمبروار یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

تفسیری اقوال

"یہاں فجر سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں ارباب تفسیر کی مختلف رائیں ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) فجر سے یہاں ہر روز کی صبح مراد ہے۔

(۲) فجر بول کر پورا دن مراد لیا گیا ہے۔

(۳) فجر سے محرم کی پہلی تاریخ کی صبح مراد ہے۔

(۴) فجر سے یوم النحر کی صبح مراد ہے۔
(۵) فجر سے روز مزدلفہ کی صبح مراد ہے۔
(۶) ذی الحجہ کی پہلی تاریخ مراد ہے۔

دس راتوں سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں بھی امام موصوف نے کئی اقوال جمع کر دیے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں مراد ہیں۔
(۲) رمضان کے آخری دس دن مراد ہیں۔
(۳) محرم کا پہلا عشرہ مراد ہے۔

جفت وطاق سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں بھی امام موصوف نے بہت سے اقوال جمع کر دیے ہیں جو یہ ہیں:

(۱) جفت وطاق سے نمازیں مراد ہیں، اس لیے کہ کچھ نمازیں جفت ہوتی ہیں اور کچھ طاق۔
(۲) طاق سے یوم عرفہ اور جفت سے یوم النحر مراد ہے۔
(۳) جفت سے ساری مخلوق مراد ہے اور طاق سے اللہ تعالیٰ۔
(۴) جفت سے صبح کی نماز اور طاق سے مغرب کی نماز مراد ہے۔
(۵) جفت وطاق سے مغرب کی نماز مراد ہے، ابتدائی دو رکعتیں جفت ہوتی ہیں اور تیسری رکعت طاق ہوتی ہے۔
(۶) جفت سے ایام منیٰ (ذی الحجہ کی گیارہویں اور بارہویں تاریخیں) مراد ہیں اور طاق سے تیرہویں ذی الحجہ۔

(۷) جفت سے ذی الحجہ کے دس دن مراد ہیں اور طاق سے منیٰ کے تینوں ایام۔

(۸) جفت وطاق سے آدم وحوا مراد ہیں۔

(۹) جفت سے آدم وحوا مراد ہیں اور طاق سے اللہ تعالیٰ۔

(۱۰) جفت وطاق سے ساری خلقت مراد ہے۔

(۱۱) جفت سے جنّت کے درجات مراد ہیں، اس لیے کہ وہ آٹھ ہیں اور طاق سے دوزخ کے تمام طبقے مراد ہیں، کیونکہ وہ سات ہیں۔

(۱۲) جفت سے صفا ومروہ مراد ہیں اور طاق سے خانہ کعبہ۔

(۱۳) جفت سے رات ودن مراد ہیں اور طاق سے وہ دن مراد ہے جس کے بعد رات نہیں آئے گی، اور وہ ہے قیامت کا دن۔

(۱۴) جفت وطاق سے سارے اعداد مراد ہیں، اس لیے کہ کوئی بھی عدد یا تو جفت ہوتا ہے یا طاق۔ گویا یہاں اللہ تعالیٰ نے حساب کتاب کی قسم کھائی ہے۔

(۱۵) جفت سے خانہ کعبہ اور مسجد نبوی مراد ہے اور طاق سے بیت المقدس۔

(۱۶) جفت سے حج قران یا حج تمتع مراد ہے اور طاق سے حج افراد۔

(۱۷) جفت سے سارے حیوان مراد ہیں، اس لیے کہ تمام حیوانات میں نر و مادہ ہوتے ہیں اور طاق سے جمادات مراد ہیں۔

اسی طرح "واللیل اذا یسر" کے بارے میں امام قرطبیؒ تین رائیں نقل

فرماتے ہیں:

(۱) مزدلفہ کی رات (۲) شب قدر (۳) تمام راتیں"۔

یہ چار الفاظ ہیں، ان چاروں الفاظ سے متعلق اتنے سارے اقوال ہیں جو باہم دگر بالکل مختلف ہیں، ظاہر ہے یہ سارے اقوال صحیح نہیں ہو سکتے، ان چاروں چیزوں سے متعلق جو بہت سے اقوال بیان کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی چار ہی اقوال صحیح ہو سکتے ہیں، بقیہ اقوال لازماً بے محل اور ناقابلِ قبول ہوں گے۔ اب بتاؤ اگر ایک طالب قرآن کے سامنے یہ سارے اقوال رکھ دیے جائیں، تو کیا وہ ان میں سے چار صحیح اقوال کا انتخاب کر سکتا ہے؟ کیا اس کا ذہن ان بہت سے اقوال کے اندر الجھ کر نہ رہ جائے گا۔ اور کیا اس کے حصّہ میں سوائے تحیر و اضطراب کے اور بھی کچھ آئے گا؟ اس کی مثال ٹھیک اس کمسن بچے کی سی ہوگی جس کے سامنے پچیس پیالیاں رکھ دی گئی ہوں اور ان پچیسوں پیالیوں میں مختلف چیزیں رکھی ہوئی ہوں، جن میں سے کوئی ایک ہی چیز کھانے کی ہو، بقیہ چیزیں اس کے لیے مضر یا ناموافق ہوں، بتاؤ کیا وہ بچہ ان پچیس پیالیوں میں سے اپنے مناسب حال کسی ایک پیالی کا انتخاب کر سکے گا؟ بعینہٖ یہی مثال ان بہت سے تفسیری اقوال کی ہوا کرتی ہے جن کے اندر سے صحیح اقوال کا انتخاب کرنا طلبہ تو درکنار اچھے اچھے اساتذہ کے لیے انتہائی دشوار ہوتا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اس طرح کے مواقع پر ہمارے یہ اکابر مفسرین بھی باہم مختلف اور یکسر متضاد اقوال میں سے کسی صحیح تر قول کا انتخاب نہ کر سکے، اس لیے انھوں نے عافیت اسی میں

سمجھی کہ تفسیر آیات سے متعلق جتنے اقوال بھی مل سکیں، ان سب کو اکٹھا کر دیں، مولانا فراہی کا حال اس سے بالکل مختلف ہے، وہ بہت سے مختلف اور متضاد قسم کے اقوال جمع کر دینے کے عادی نہیں، وہ اگر کہیں متعدد اقوال کا تذکرہ کرتے ہیں تو لازماً ان کے درمیان محاکمہ بھی کرتے ہیں اور نہایت ٹھوس دلائل کی روشنی میں اپنی پسندیدہ اور مرجح رائے کا اظہار بھی کرتے ہیں، مثال کے طور پر یہی سورۂ فجر ہے، مولانا اس کی باقاعدہ تفسیر تو نہیں لکھ سکے، البتہ اس سے متعلق ان کے مسودات میں کچھ نوٹس اور کچھ اشارات ملتے ہیں، زیرِ بحث آیات کے سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

امام فراہی کی تاویل

(۲) [عشر] مقرہ (۱-۴)

فھو الذی خلق الصبح ونور الليالي افلا ينظر عباده وقدر الشهور شفعًا ووترًا كما قال:

(والقمر قدرناه منازل) وجعل الليل ريثما يكون ثم يأتي بالنهار فجعل ايضًا غالبًا ولكن لا يجاوز احد قدره (۵) [قسم] شهادة على ان الله امهل العباد ويبتليهم وهم لا يعزلون عنه۔

یہ بھی یادداشت کے طور پر مولانا کے چند اشارات ہیں، جو زیرِ بحث آیات کے سلسلہ میں مولانا کے مسودات میں ملتے ہیں، اگر انھیں اس سورہ کی تفسیر لکھنے کا موقع ملا ہوتا تو وہ مفسرین کی تمام رایوں پر گفتگو کرتے ہوئے اور ان

راویوں کے اندر جو کمزور گوشے ہیں، ان کی نشاندہی کرتے ہُوئے مضبوط علمی دلائل کی روشنی میں اپنی پسندیدہ تاویل کا ذکر کرتے اور اسی وقت ان کے ذہن کی رسائی، فکر کی گہرائی اور طرزِ تفسیر کی رعنائی کا ہمیں صحیح طور سے اندازہ ہو سکتا، بہرکیف ان اشارات سے ان کی جو منشا معلوم ہوتی ہے وہ ہم یہاں لکھتے ہیں۔

وہ فجر سے کوئی خاص فجر نہیں، بلکہ ہر روز کی صبح مراد لیتے ہیں، دس راتوں سے چاندنی راتیں جفت اور طاق سے انتیس ۲۹ اور تیس ۳۰ کے مہینے اور رات سے ہر آنے والی رات مراد لیتے ہیں۔ غالباً ان آیات سے وہ اس طرح کا مفہوم لے رہے ہیں کہ خدا ہی ہے جس کے اذن سے ہر روز صبح کی پو پھٹتی ہے اُفق سے نور کی لہریں اٹھتی ہیں اور رفتہ رفتہ وہ سارے عالم پر چھا جاتی ہیں، نیز وہی ہے جس کے حکم سے رات میں چاند طلوع ہوتا ہے اور وہ سارے آفاق میں نور بکھیر دیتا ہے، بالفاظِ دیگر اس کائنات کے اندر نور کا سرچشمہ وہی ہے، سورج اور چاند جو اس دنیا کے اندر روشنی کا منبع ہیں، وہ اسی کے تابع و محکوم اور اسی کی مخلوق ہیں، پھر کیا وہ خدا جو صبح کا خالق اور آفتاب و ماہتاب کا مالک ہے۔ جو اس کائنات کے اندر نور کا سرچشمہ اور روشنی کا منبع ہے، اس کی نگاہ سے بندوں کی کوئی نقل و حرکت یا کوئی ادا پوشیدہ رہ سکتی ہے؟ کیا اس کی نگاہوں کے سامنے کبھی تاریکی آسکتی ہے؟ پھر جس طرح چاند اور سورج خدا کی مخلوق ہیں، اسی طرح وہ اس کے حکم کے پابند اور مکمل طور سے اس کے آگے سرفگندہ ہیں، اس نے ان کے لیے جو نظام، جو ضابطہ، جو قانون اور جو وقت مقرر کر دیا ہے، وہ سختی سے اس کی پابندی کر رہے ہیں۔ چاند کبھی تیس ۳۰ کا

طلوع ہوتا ہے اور کبھی انتیس[۲۹] کا، یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کبھی اس نظام کی خلاف ورزی کر سکے، یعنی وہ ہمیشہ تیس ہی کا طلوع ہونے لگے یا کبھی تیس کا نہ طلوع ہو، ہمیشہ انتیس ہی کا طلوع ہوتا رہے، اسی طرح سورج کے طلوع و غروب کے لیے جو ضابطہ بنا دیا گیا ہے، وہ سختی سے اس کی پابندی کر رہا ہے، وہ اپنے مقررہ اوقات پر طلوع ہوتا ہے اور مقررہ اوقات پر غروب ہو جاتا ہے، کچھ اسی قسم کی بات ایک دوسری جگہ یوں فرمائی گئی ہے:

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ، لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ، وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۔ (سورۃ یٰسین)

(اور چاند کے لیے ہم نے بہت سی منزلیں مقرر کیں، یہاں تک کہ وہ پھر ہو گیا جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی، نہ سورج کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے، اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں)

تو جب سورج اور چاند جو اس کائنات کی دو عظیم ترین مخلوق ہیں اور تمھاری نگاہ میں اس کائنات کے دو زبردست دیوتا ہیں، وہ اس طرح حکم رب کے پابند ہیں اور خدا کے بنائے ہوئے نظام سے ذرا بھی سرتابی نہیں کر سکتے، تو پھر تمھاری کیا حیثیت ہے؟ تم اگر اس کی نافرمانی اور اس کے حکم سے سرتابی کرتے ہو، تو کس بل بوتے پر؟ پھر تم اس سے سرتابی کر کے جاؤ گے کہاں؟ تم سے پہلے بھی تو ایک سے ایک زبردست قومیں گزری ہیں، قوم عاد اور

قوم ثمود کی جاہ و سطوت کا کیا عالم تھا! فرعون کتنے دبدبے کا بادشاہ اور کتنے زبردست لاؤ لشکر کا مالک تھا! مگر جب ان لوگوں نے اس شہنشاہ کائنات سے سرکشی کی، تو دنیا نے دیکھ لیا کہ ان کا کتنا عبرتناک انجام ہوا؟ جس زمین پر ہر طرف ان کی جاہ و سطوت اور قوت و اقتدار کے ڈنکے بج رہے تھے، کیا اس زمین پر ان کا کوئی نام و نشان رہ گیا؟ پھر تم کس فریب کا شکار ہو! وہ تمھاری ساری نقل و حرکت دیکھ رہا ہے اور مہلت پر مہلت دیے چلا جا رہا ہے، مگر جب تمھارا وقت آ جائے گا اور مہلت کی یہ ساعت ختم ہو جائے گی، تو جس طرح تمھارے پیش رووں پر عذاب الٰہی کے تازیانے برسے، اسی طرح تم پر بھی برس پڑیں گے اور اس وقت کوئی طاقت نہیں ہو گی جو تمھیں پناہ دے سکے، یا تمھاری کسی قسم کی مدد کر سکے۔

غور کرو، ان آیات کی ایک یہ تاویل ہے، نہایت صاف ستھری، واضح اور متعین تاویل، جو آگے کی آیات سے پوری طرح مناسبت رکھتی ہے اور دوسری طرف باہم مختلف اور متضاد تاویلات کا وہ انبار ہے، جو قدیم مفسرین کی تفسیروں میں ہے، جس کو دیکھ کر ایک طالب علم پہلے ہی سہم جاتا ہے، پھر جوں جوں وہ آگے بڑھتا جاتا ہے، اس کا تحیر اور ذہنی اضطراب بڑھتا ہی جاتا ہے، اور بالآخر اسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ شاید یہ قرآن ہمارے سمجھنے کا نہیں، بس صحابہ و تابعین اور اکابر مفسرین کا ہی یہ کام تھا کہ اسے سمجھیں اور اس میں غواصی کریں، ہمارا کام بس یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھ گئے ہیں اس کو پڑھ لیا کریں اور اسی پر قناعت کر لیں، خواہ اس سے تشفی ہو یا نہ ہو۔

اسی قسم کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو، سورۂ کوثر میں اللہ تعالیٰ نے کوثر سے کیا مراد لیا ہے؟ اس سلسلہ میں ارباب تاویل کے مختلف اقوال ہیں، علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" کے اندر اس سلسلہ میں ۱۶ اقوال نقل کیے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(۱) جنت میں ایک نہر ہے۔

(۲) موقف میں حضورؐ کا ایک حوض ہوگا۔

(۳) کوثر سے مراد نبوت اور کتاب ہے، یہ عکرمہؓ کا قول ہے۔

(۴) کوثر سے مراد قرآن ہے، یہ حسن بصری کا قول ہے۔

(۵) کوثر سے مراد اسلام ہے، یہ مغیرہؓ کی روایت ہے۔

(۶) کوثر سے مراد قرآن کو آسان کرنا اور شرائع میں تخفیف کرنا ہے یہ حسین بن فضل کا قول ہے۔

(۷) اصحاب واتباع اور امت کی کثرت مراد ہے۔ یہ ابوبکر بن عیاش اور یمان بن رباب کا قول ہے۔

(۸) ایثار مراد ہے، یہ ابن کیسان کا قول ہے۔

(۹) ماوردی نے کہا کہ اس سے شہرت اور نیک نامی مراد ہے۔

(۱۰) تمہارے دل میں ایک نور ہے جس نے تمہیں ہمارا پتہ دیا اور تم کو سب سے کاٹ کر ہماری طرف یکسو کر دیا۔

(۱۱) کوثر سے مراد شفاعت ہے۔

(۱۲) ثعلبی نے کہا کہ اس سے مراد خدا تعالیٰ کے وہ معجزات ہیں،

جن کے ذریعہ اہلِ ایمان کو ایمان کی توفیق حاصل ہوئی۔

(۱۳) ہلال بن یساف کہتے ہیں کہ اس سے مراد لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔

(۱۴) کوثر سے مراد دین کا فہم ہے۔

(۱۵) کوثر سے مراد پنج وقتہ نمازیں ہیں۔

(۱۶) کوثر سے مراد بڑی بات ہے۔

یہ تمام اقوال نقل کرنے کے بعد علاّمہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: ان سب میں صحیح تر قول پہلا اور دوسرا ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے صحیح حدیث آتی ہے، اس کے علاوہ کوثر کی تفسیر میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ اس حوض کے علاوہ ہے جو آپ کو عطا کیا گیا ہے۔

اسی لفظ کوثر کے سلسلہ میں علاّمہ فراہی کی بھی تحقیق ملاحظہ ہو، انھوں نے اس سلسلہ میں بڑی طویل بحث کی ہے، جس کا کچھ حصّہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں، جو تفصیل کے طالب ہوں، انھیں علاّمہ کی تفسیر سورۂ کوثر کا مطالعہ کرنا چاہیے، علاّمہ فرماتے ہیں:

"پچھلی فصلوں میں معلوم ہو چکا ہے کہ سلف نے کوثر آخرت کے بارہ میں اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ لفظ کے عموم اور صیغۂ ماضی کی رعایت سے ان چیزوں کو بھی اس کے دائرے میں داخل کر دیا ہے، جو داخل ہو سکتی تھیں، تاکہ لفظ عام، وسیع اور اپنی دلالت میں اسم بامسمّیٰ (کوثر) ہو، یہی وجہ ہے کہ بعد کے مفسرین نے اس

میں مزید جستجو اور کاوش جائز سمجھی۔ اگر اس کے متعلق کچھ کہنا بدعت و ضلالت ہوتا تو وہ خاموش رہتے اور سلف بھی اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ کرتے، اس وجہ سے اگر میں کسی ایسی تاویل کا سراغ لگاؤں، جو دونوں کوثروں کو ایک کر دے، تو جس طرح میں سلف کو اس کی تاویل میں ایک دُوسرے کے خلاف نہیں پاتا، اسی طرح اپنے کو بھی ان کے خلاف نہ سمجھوں گا، البتہ فرق یہ ہوگا کہ انھوں نے اس کو عام قرار دے کر اس سے حوض یا نہر جنّت سمجھی اور ان کے ماسوا ہر وہ چیز جس میں خیر کثیر ہو، مثلاً قرآن، حکمت، اسلام، نبوّت جن کو حوض یا نہر سے کوئی مناسبت نہیں ہے، مگر میں اس سے وہ چیز مراد لوں گا جس کو اس حوض یا نہر سے نہایت واضح مشابہت ہے، جس کی کیفیات آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بیان فرمائی ہیں اور جس کی حقیقت و روحانیت شب معراج میں آپ کے سامنے بے نقاب ہوئی، کیونکہ یہ ثابت ہے کہ اس مبارک رات میں جب پروردگار عالم نے اس عالم آب و گل کی بہت سی چیزوں کے حقائق آپ کے لیے بے حجاب کیے تو اس کوثر کی روحانیت کا بھی آپ کو مشاہدہ کرایا، جو اس دنیا میں آپ کو بخشا گیا۔

عالم غیب کے جو اسرار آپ پر بے نقاب ہوتے تھے، آپ کبھی ان کا ذکر تصریحاً فرماتے تھے، مثلاً سورۂ بقرہ اور آل عمران

کے متعلق فرمایا: "وہ دونوں بدلیوں کی شکل میں نمودار ہوں گی"۔ دُنیا کی بابت فرمایا: "وہ ایک پھوسٹ بڑھیا کی شکل میں آئے گی"۔ موت کی نسبت فرمایا: "وہ ایک مینڈھے کی صورت میں آئے گی"۔ اور کبھی صرف اشارے فرما دیا کرتے تھے تاکہ لوگ اس پر تدبر کریں اور ان کے ذہن و عقل کی تربیت ہو، اس وجہ سے یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریحًا یہ کہیں نہیں فرمایا کہ خانہ کعبہ قیامت کے دن حوض کوثر کی شکل میں نمودار ہوگا کیونکہ آپؐ نے اس کی طرف اشارات فرمائے ہیں اور ہم کو اشارات پر غور و فکر کی ترغیب دی ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم ان اشارات کی تفصیل کرتے ہیں جو ہمارے دعوٰی پر حجت ہیں:

(۱) یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے اندر خدا کے لیے ایک فطری شوق و رغبت موجود ہے، انسان اس چیز سے محروم رہ کر تسلّی نہیں پا سکتا۔ انسان کی یہی فطرت مذاہب و ادیان کے وجود کا باعث ہوئی ہے، اسی اشتیاق و بے قراری کا یہ نتیجہ ہے کہ تم دنیا کی کوئی قوم مذہب سے خالی نہیں پاتے۔

اب سوچو! اس فطری اشتیاق اور چاہت کی سب سے زیادہ موزوں تعبیر "پیاس" کے سوا اور کس چیز سے ہو سکتی ہے؟ زبور میں یہی تمثیل اکثر استعمال ہوئی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو اس کو

پیشِ نظر رکھ کر ان عاشقانِ توحید کے حال پر غور کرو، جو حج کے ایام میں بیت اللہ کے پاس سراپا شوق و آرزو ہو کر جمع ہوتے ہیں، کیا ان کی مثال ان خشک لب پیاسوں کی نہیں ہے جو شدید تشنگی سے مضطر ہو کر کسی حوض کے گرد جمع ہو گئے ہوں؟ اگر یہ مشابہت واضح ہے تو لامحالہ خانہ کعبہ ان کے لیے دنیا میں اس حوضِ کوثر کی مثال ہے جس پر میدانِ حشر میں وہ یکجا ہوں گے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری مسجدوں کو نہر سے تشبیہ دی ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

ارأیتم لوانّ نھرًا بباب احدکم یغتسل فیہ کلّ یوم خمسًا۔

(بھلا بتاؤ! اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک نہر ہو، جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو۔)

یہ تمثیل بھی ایک دوسرے پہلو سے پانی ہی کی تمثیل ہے، پانی جس طرح سیرابی کا ذریعہ ہے، اسی طرح طہارت کا بھی ذریعہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ ہماری تمام نمازوں کا سرچشمہ بیت اللہ ہے، اس اعتبار سے ہماری تمام مسجدیں گویا اسی سرچشمہ کی نہریں ہیں، جن سے ہم سیرابی اور پاکی حاصل کرتے ہیں۔

(۳) خانہ کعبہ کے اجتماع سے جس طرح دوسری امتوں کے مقابلہ میں امتِ مسلمہ کی کثرت کا اظہار ہوتا ہے، اسی طرح حوضِ کوثر پر اس کا

اجتماع اس کی کثرت کے اظہار کا سبب ہوگا، اس کثرت کے ظاہر کرنے کی بہترین صورت یہی تھی کہ کسی ایک مخصوص مقام پر اس کا اجتماع ہو، دوسری اُمتیں اس اجتماع سے اندازہ کرتی ہیں کہ زائرین بیت اللہ کا یہ متلاطم سمندر اس بحرِ بیکراں کا صرف ایک قطرہ ہے جو پوری روئے زمین پر پھیلا ہُوا ہے پس جس طرح حوضِ کوثر پر اس کے اجتماع سے دوسرے انبیاء کی اُمتوں پر اس کی کثرت واضح ہوگی، اسی طرح موسمِ حج میں خانہ کعبہ کے پاس اس کا اجتماع اظہارِ کثرت کا ایک جلوہ ہے، غور کرو لفظ کوثر ان دونوں کی مطابقت کو کس طرح واضح کر رہا ہے۔

(۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آپؐ اپنی اُمت کو حوضِ کوثر پر وضو کے آثار سے پہچانیں گے، یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ خلوصِ قلب کے ساتھ اس گھر کی زیارت کریں گے۔ وہی لوگ آخرت میں اس حوض پر آئیں گے۔ جو اس گھر کی حقیقت ہے۔

(۵) فتح مکّہ کو خدا نے اُمت کی کثرت کا سبب بنایا، چنانچہ حجِ اکبر کے بعد لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہُوئے۔

(۶) مسجد حرام کو خدا نے "مبارک" (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا ہے:

انّ اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکًا و هدی للعٰلمین ٥

(بلاشبہ خدا کا پہلا گھر جو لوگوں کے لیے تعمیر ہوا، وہ ہے جو مکہ میں ہے، سرچشمۂ خیر و برکت اور لوگوں کے لیے ہدایت)

اس گھر کو خدا نے ایسی برکت سے نوازا کہ تمام عالم اس کی برکتوں سے مالا مال ہوا، جیسا کہ ابراہیم خلیلؑ سے وعدہ کیا گیا تھا حضرت اسماعیلؑ کی ذریت میں خدا کی برکت حضرت اسحاقؑ کی ذریت سے زیادہ ہوئی، اس اجمال کی تفصیل سورۂ فیل میں گزر چکی ہے ظاہر ہے کہ یہ تمام برکتیں اسی بیت اللہ اور نماز و قربانی کا ثمرہ ہیں۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ خدا نے قرآن کو بھی مبارک کہا ہے، اس وجہ سے حوض کوثر کے ساتھ قرآن کی مشابہت بھی واضح ہے لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے، قرآن کو مبارک دوسرے پہلو سے کہا گیا ہے، جس طرح بارش کو خدا نے مبارک کہا ہے، اسی طرح قرآن کو بھی مبارک کہا ہے، بارش آسمان سے برس کر مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے اور قرآن نے آسمان سے نازل ہو کر مردہ دلوں کو زندہ کر دیا، قرآن کو مبارک کہنے میں حوض سے مشابہت کا کوئی پہلو نہیں پیدا ہوتا، قرآن کی عظمت اور بے پایاں وسعت کے لحاظ سے یہ تشبیہ بلاغت کے خلاف ہوگی۔

(۷) یہ سورہ صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی ہے، جو فتح مکہ، حج، نماز، قربانی، غلبۂ اسلام اور کثرت امت کا فتح باب ہے، یہاں تک کہ خدا نے اس صلح کو "فتح مبین" سے تعبیر کیا، سورہ کے زمانہ

نزول پر چودھویں فصل میں مفصل گفتگو ہوگی۔

(۸) حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس حوض کے ایک گوشہ کے متعلّق خبر دے کر باقی کی طرف اشارہ کر دیا ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں مروی ہے:

قال علیہ السّلام ما بین بیتی و منبری روضۃ من ریاض الجنّۃ و منبری علیٰ حوضی ہ

(حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنّت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، اور میرا منبر میرے حوض کے اوپر ہے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی مبارک سرزمین، جس میں حجاج یکجا ہوتے ہیں، اس حوض کوثر کی شکل اختیار کر لے گی، جس کی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خبر دی ہے، میرے نزدیک بخاری کی مندرجہ ذیل روایت (مذکورہ نمبر ۹) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

(۹) نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم ایک دِن نکلے، ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھائی، پھر منبر پر تشریف لائے (یعنی منبر مسجد پر) اور فرمایا:

انی فرط لکم وانا شھید علیکم وانی واللہ لانظر الی حوضی الاٰن وانی اعطیت مفاتیح خزائن الارض او مفاتیح الارض وانی واللہ ما اخاف علیکم ان تشرکوا بعدی ولکن اخاف علیکم ان تنافسوا فیھا۔

(میں تمھارے لیے حوض پر آگے جانے والا ہوں اور تمھارے لیے شہادت دوں گا اور قسم خدا کی میں اس وقت اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں اور مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں، یا (راوی کو شبہ ہے) آپ نے یہ فرمایا کہ زمین کی کنجیاں دی گئی ہیں اور مجھے خدا کی قسم تم سے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ تم میرے بعد شرک کرو گے، البتہ اس بات کا ڈر ہے کہ تمھاری بھاگ دوڑ طلب دنیا کی راہ میں ہو جائے۔)

"فرط" عربی میں اس شخص کو کہتے ہیں جو حوض پر پہلے سے پہنچ کر قافلے کے لیے ڈول اور رسی وغیرہ کا انتظام کر کے حوض کو بھر رکھتا ہے" شہید علیکم" سے یہ مطلب ہے کہ آپ اپنی امّت کو پہچانیں گے اور جو لوگ آپ کی امّت میں سے ہوں گے' ان کے امّت میں سے ہونے کی گواہی دیں گے، یہ آپ کی طرف سے شفاعت ہو گی۔

ان لفظوں میں آپ نے ان حالات کو بیان فرمایا، جو آخرت میں پیش آئیں گے، پھر آپ نے اشارہ فرما دیا کہ اس حوض کوثر کی ظاہری مثال آپ کے سامنے ہے، کیونکہ، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، آپؐ کا منبر آپؐ کے حوض کے اوپر ہے، اور یہ جو آپؐ نے فرمایا: مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں، تو اس سے فتح مکّہ کے اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے

پُورا فرمایا، چنانچہ فتح مکہ تمام زمین اور اس کے خزانوں کی فتح کا دیباچہ ثابت ہُوئی۔

(۱۰) حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ظاہر فرما دیا ہے کہ آپ کے حوض کا طول مکہ اور مدینہ کے مابین مسافت جتنا ہے، اس لطیف اشارے سے ارض حرم اور آپ کے حوض کی مطابقت بھی واضح ہو گئی۔

لیکن یہاں ایک شخص کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مراد یہی تھی تو اس کو کھول کر کیوں نہیں فرما دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس حقیقت کی تعبیر کے لیے قرآن مجید نے جو لفظ انتخاب کیا ہے، وہ بے شمار حقائق و معارف کا گنجینہ اور ہمارے لیے دعوت تفکّر ہے، یہ ایک لفظ امّت کی کثرت، مکّہ کی فتح، ایام حج میں خانہ کعبہ کے پاس اور محشر میں حوض کوثر پر اُمّت کے ازدحام کو بیک وقت ظاہر کر رہا ہے۔

یہ تمام اشارات ہم نے اس مقصد کی تمہید و تائید کے لیے یکجا کیے ہیں، جو نظم کلام سے واضح ہو رہا ہے اور جس کی تفصیل انشاء اللہ اگلی فصلوں میں آئے گی۔

اب تھوڑی دیر توقف کر کے حوض کوثر کی شکل و ہیئت پر بھی غور کر لینا چاہیے، ہمارا خیال ہے کہ اس سے بھی ہمارے مذکورہ نظریے کی تائید ہو رہی ہے کہ کوثر آخرت درحقیقت خانہ کعبہ اور

اس کے ماحول کی ہی روحانی تصویر ہے، بعد کی فصل میں اس اجمال کی تفصیل ہے۔"

یہ ہے علامہ فراہیؒ کی وہ تاویل جو لفظ کوثر کے سلسلہ میں انھوں نے تفسیر سورہ کوثر میں لکھی ہے، ان کی تحقیق کے مطابق یہاں لفظ کوثر سے مراد خانۂ کعبہ ہے، سیاق و سباق، نظم کلام، لغت اور روایات کی روشنی میں انھیں اپنی اس تحقیق پر ایسا یقین ہے، جس میں شک کی کوئی آمیزش نہیں، چنانچہ انھوں نے اس تاویل کو مختلف پہلوؤں سے نہایت واضح اور مدلل کر کے اپنی تفسیر میں پیش کیا ہے، ممکن نہیں کہ کوئی قاری صاف ذہن سے اس کا مطالعہ کرے اور وہ قائل نہ ہو جائے۔ جس یقین و اطمینان کی کیفیت سے سرشار ہو کر علامہ فراہیؒ نے اسے لکھا ہے، ممکن نہیں کہ اسے پڑھنے والا پڑھ کر اسی یقین و اطمینان کی کیفیت سے سرشار نہ ہو جائے، اس کے بالمقابل علامہ قرطبیؒ کی تفسیر کو دیکھو، اس میں انھوں نے کوثر کے سلسلہ میں ۱۶ اقوال درج کر دیے ہیں، کیا ان سولہ اقوال کے درمیان سے کسی صحیح تر قول کا انتخاب کرنا ہر ایک کے بس کی بات ہے؟ اگر وہ سولہ اقوال کسی ناپختہ کار شخص یا کسی غیر جوہری کے سامنے رکھ دیے جائیں تو کیا حیرانی و بے اطمینانی اور پراگندہ خیالی کے علاوہ اور بھی کچھ اس کے حصے میں آئے گا؟ بلاشبہ ان سولہ اقوال میں سے دو کو علامہ قرطبیؒ نے ترجیح بھی دے دی ہے، مگر اس کی حیثیت ترجیح بلا مرجح یا دعوائے بے دلیل سے زیادہ کی نہیں، اگر اس ترجیح کے لیے محض اتنی دلیل کافی ہے کہ روایات میں حوض کوثر یا

نہر کوثر کا ذکر آگیا ہے، تو سوال یہ ہے کہ دوسرے بزرگ ائمہ اور جلیل القدر تابعین نے اس کے علاوہ دوسرے معنی کیوں لیے؟ کیا ان سب کے سامنے یہ روایات نہیں تھیں؟ مختصر یہ کہ علامہ قرطبیؒ نے یہ ایک ایسی دلیل دی ہے جس سے کسی بھی طالب علم کو تشفی نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اس کی الجھنوں میں ایک اور الجھن کا اضافہ ہو جاتا ہے کہ آخر ان صریح روایات کے ہوتے ہوئے علمائے اُمت دوسرے اقوال کی طرف کیوں جھک گئے؟ انھوں نے روایات سے ہٹ کر آیت کی دوسری تاویل کیوں کی؟ اسی لیے ان تفاسیر کے بارے میں ہمارا مجموعی تاثر یہ ہے کہ ان کی فیض بخشیوں کا دائرہ بہت محدود ہے، طلبۂ قرآن کے لیے وہ اپنے اندر کچھ زیادہ روشنی یا رہنمائی نہیں رکھتیں، بس اساتذۂ فن ہی ان سے فائدہ اٹھا سکتے اور کچھ رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں، اس کے برعکس امام فراہی کی تفسیریں یکساں طور پر سب کے لیے روشنی فراہم کرتی اور سب کی رہنمائی کرتی ہیں، اگر کوئی مبتدی ہے تو اس کے اندر وہ قرآن فہمی کا ذوق اور اس سے بے پناہ شغف پیدا کر دیتی ہیں اور اگر کوئی منتہی ہے تو اس کے قرآنی ذوق کو مزید جلا بخشتی اور اس کی صلاحیتوں کو اور نکھارتی ہیں۔

قدیم تفاسیر کی اہمیت سے انکار نہیں!

ان سطور سے نعوذ باللہ ان تفاسیر کی تنقیص مقصود نہیں، تنقیص کا کیا سوال، کہ ہم تو ان کے قدر دانوں اور خوشہ چینوں میں سے ہیں، ہم تو برابر ان

سے فائدہ اُٹھاتے اور مطالعۂ قرآن کے سلسلہ میں ان سے مدد لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان مفسرین کی قبریں ٹھنڈی رکھے کہ انھوں نے قرآن پاک کے سلسلہ میں اہم خدمات انجام دی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان تفاسیر کے درمیان باہم موازنہ نہ کیا جائے، اور ایک کو دوسرے پر جو فضیلت و برتری حاصل ہے، اس کا اعتراف کرنا چھوڑ دیا جائے، ان تفاسیر کی قدر و منزلت کو تسلیم کرتے ہوئے ان پر تفاسیر فراہیؒ کو جو امتیاز حاصل ہے، اس کا اظہار و اعتراف کرنا ہم اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو یہ چیز ہماری علمی دیانت کے منافی ہوگی، یہ ایک حقیقت ہے کہ امام فراہیؒ کی یہ تفسیریں آدمی کے دل میں غیر شعوری طور پر قرآن پاک کی غیر معمولی عظمت کا سکہ بٹھا دیتی ہیں، یہ قرآن پاک سے انس و محبت اور اس سے غیر معمولی شغف پیدا کر دیتی ہیں، نیز ان کے مسلسل مطالعہ سے ایک طالب قرآن کے اندر قرآن فہمی کا صحیح ذوق پیدا ہو جاتا ہے، فکر و نظر میں ایسی وسعت و بلندی اور طبیعت میں ایسا ذوق تجسس پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ فکر و تحقیق کے میدان میں بے تکلف آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، کسی تنگ دائرہ میں محصور ہو کر رہنا اب اس کے لیے ممکن نہیں رہ جاتا، یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو تفاسیر فراہیؒ کے علاوہ ہمیں اور کہیں نظر نہیں آئی۔

مولانا مودودی کا تاثر

تفاسیر فراہیؒ کی انہی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متکلم

اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ترجمان القرآن جلد ۸ شمارہ ۱ میں لکھتے ہیں:
"علامہ فراہیؒ ایک بڑے درجہ کے محقق تھے، انھوں نے اپنی تفسیروں میں تحقیق کا ایک خاص مجتہدانہ اسلوب اختیار کیا ہے، جو دوسرے مفسرین کے اسالیب سے بہت کچھ مختلف ہے، اس اسلوب خاص سے انھوں نے جو مطالب اخذ کیے ہیں اور آیات کے جو معانی متعین کیے ہیں، ان میں اختلاف کی ویسی ہی گنجائش ہے جیسی دوسرے مفسرین کے نتائج تحقیق میں، لیکن ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ناظر کے زاویۂ نظر کو وسیع کرتا ہے اور قرآن مجید کے معانی و مطالب سمجھنے کے لیے تحقیق و تفحص اور مواد علمی کے وسیع تر میدانوں کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خواہ کوئی شخص ان کے نتائج تحقیق سے کلی اتفاق نہ رکھتا ہو، مگر وہ ان کی تحقیقات میں ایسے بیش قیمت علمی فوائد پاتا ہے، جن سے کوئی طالب العلم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔"

ذاتی تجربات

تفاسیر فراہیؒ کے بارے میں یہ مولانا محترم کی رائے ہے، خود ہم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہماری کوئی سرسری رائے نہیں، بلکہ یہ ایک تجربہ ہے، ہمارا بھی تجربہ ہے اور دوسرے بہت سے ساتھیوں کا بھی یہی تجربہ ہے، میں اپنے رب کریم کا جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے، کہ اس نے بچپن ہی سے

مجھے قرآن پاک کا شیدائی بنایا ہے، مجھے شروع سے ہی یہ تمنا رہی ہے کہ اپنے محسن آقا کی اس کتاب کو اپنے سینے میں محفوظ کر لوں، پھر جب کچھ شعور بلند ہوا، تو یہ آرزو دامن گیر رہی کہ کسی طرح اس کے علوم و معارف سے بھی بہرہ مند ہو جاؤں اور اس کے آسمان حکمت سے کچھ تارے توڑ کر اپنی قبائے زندگی میں ٹانک لوں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پانچ چھ سال کی عمر میں جب پہلی بار میرے والد نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھو گے، تو میں نے بے ساختہ جواب دیا: "میں قرآن پاک یاد کروں گا"، پھر جب مکتب کی تعلیم سے فراغت کے بعد عربی پڑھنی شروع کی اور عربی کی اتنی گردانیں اور صیغے یاد ہو گئے کہ میں عربی کے کچھ چھوٹے موٹے جملے بنانے اور سمجھنے لگا، تو میری تلاوت قرآن کی مقدار بہت کم ہو گئی، اب میں بہت ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کرتا، خواہش یہ ہوتی کہ قرآن پاک کے معانی بھی سمجھتا چلوں، مجھے یاد ہے کہ اس زمانہ میں جب میرے بڑے بھائی فجر سے پہلے اُٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتے، تو میری آنکھ کھل جاتی، میں لیٹا لیٹا اس نغمۂ لاہوتی سے محظوظ ہوتا، معنی و مفہوم پوری طرح نہ سمجھنے کے باوجود ان آیتوں کے اندر ایک عجیب سی مٹھاس اور کیفیت محسوس کرتا، پھر جب عربی کے دو سال پورے کر لیے اور تیسرا سال آیا، جس سال کے نصاب میں قرآن پاک کا درس بھی شامل تھا، تو میری خوشی کی انتہا نہ تھی، میں نے رمضان کی سالانہ چھٹیاں بڑی بے قراری کے ساتھ گزاریں، اس انتظار میں کہ جلد ہی سے شوال کا مہینہ آئے اور ہمارا نیا تعلیمی سال شروع ہو، کہ ہم بھی قرآن کی جوئے رواں سے

سیراب ہو سکیں، چنانچہ شوال کا مہینہ آیا، ہمارے نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوا، اور ہم نے قرآن پاک کا درس لینا شروع کر دیا، درس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ مگر جوں جوں درس کا سلسلہ دراز ہوتا گیا، ہمارے شوق کی بے تابیاں کم ہوتی گئیں، کیونکہ قرآن پاک کے بارے میں ہمارا پہلے سے جو تصور تھا، درس میں اسے اس تصور کے مطابق نہیں پایا، فہم قرآن کی جس روشنی کے ہم آرزومند تھے، وہ روشنی ہمیں نظر نہیں آئی، بالآخر درجہ میں جو درس ہوتا تھا، اس سے مایوس ہو کر ہم نے تفاسیر کی طرف توجہ کی۔

تشنگی جُوں کی توُں رہی

متعدد تفاسیر کا ہم نے مطالعہ کیا، مگر ہماری تشنگی جُوں کی توُں برقرار رہی، ہمیں کہیں آسودگی نہیں حاصل ہوئی، مگر خدا کا شکر ہے کہ ہیں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی کتاب اللہ کے بارے میں سوء ظن کا شکار نہیں ہوا، مجھے پہلے اس سے جو عقیدت و محبت تھی، وہ عقیدت و محبت جُوں کی توُں برقرار رہی، بلکہ روز بروز بڑھتی ہی گئی اور اسے سیکھنے کا جو شوق تھا، اس کی بھی تپش بڑھتی اور تیز تر ہوتی گئی، اس طرح ایک طرف شوق و محبت کی بے قراریاں تھیں اور دوسری طرف اپنے علم و فہم کی نارسائیاں، اس بے قراری کو قرار کیسے آئے؟ اس نارسائی کا کیا علاج کیا جائے؟ فہم قرآن کی راہ کیسے کھلے؟ معارفِ قرآنی کی کلید کہاں سے حاصل کی جائے؟ یہ مختلف سوالات تھے، جو ہر وقت ذہن پر مسلط رہتے۔

اپنی محرومی پر میں آبدیدہ ہو جاتا

کبھی کبھی تو اپنی اس محرومی پر طبیعت اس قدر متاثر ہو جاتی کہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے اور دیر تک رواں رہتے، ایک روز کا قصہ ہے، میں قرآن پاک سامنے کھولے یوں ہی غمزدہ سا بیٹھا تھا کہ ہمارے بڑے بھائی کہیں سے آ گئے، انھوں نے میری کیفیت دیکھی، اداسی کا سبب پوچھا، میں نے اپنا دل اور دردِ دل کھول کر رکھ دیا، وہ خود چونکہ قرآن پاک کے عاشق اور اس کے لذت شناس تھے، وقت کے ایک زبردست مفسر مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے تلمیذ رشید تھے اور کافی دنوں اُن کی صحبت اُٹھا چکے تھے، اس لیے انھوں نے بآسانی میرے لیے ایک نسخہ تجویز کر دیا جو فی الواقع میرے اس درد کے لیے اکسیر ثابت ہوا، اُنھوں نے مشورہ دیا کہ اللہ کا نام لے کر تفاسیر فراہیؒ کا مطالعہ کرو، اُمید ہے اللہ تعالیٰ علم و حکمت کے دروازے کھول دے گا، انھوں نے پورے خلوص و محبت کے ساتھ یہ مشورہ دیا تھا، ہم نے بھی شوق و محبت کی بیتابیوں کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا، بس یہی مبارک ساعت تھی، کہ اس کے بعد سے مجھے قرآن پاک کی لذت ملنے لگی اور اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب میں ایک طالب قرآن کے لیے آنکھوں کی کتنی ٹھنڈک رکھ دی ہے۔

⁂

تفاسیر فراہیؒ نے ذوق پیدا کر دیا

اب یہ تفاسیر میرے لیے آنکھ کا سرمہ اور رُوح کی غذا بن گئیں، مَیں نے انھیں بار بار پڑھا اور انہی کے مطالعہ سے میرے اندر کچھ قرآن فہمی کا ذوق پیدا ہوا، انہی نے مجھے مطالعۂ قرآن کا سلیقہ سکھایا اور قرآنی اسرار و معارف اور اس کے رموز حکمت کی طرف میری رہنمائی کی، یہ تنہا ہمارا تاثر نہیں، ہمارے جن ساتھیوں نے بھی تفاسیر فراہیؒ سے استفادہ کیا ہے اور ان کے دیئے ہوئے اصولوں کی روشنی میں قرآن پاک کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، ان سب کا احساس یہی ہے، ان سب کا کہنا یہی ہے کہ پہلے قرآن کے بارے میں ہمارا جو تصور تھا، ان تفاسیر کے مطالعہ کے بعد وہ تصور یکسر بدل گیا، پہلے قرآن پاک سے ہمیں عقیدت و محبت تو تھی، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس میں یہ بیکراں وسعت اور اتنی اتھاہ گہرائی ہے، یہ قرآن جو پہلے کچھ دینی مواعظ، چند اسلامی احکام اور چند اقوام و سلاطین کی سرگزشتوں کا مجموعہ معلوم ہوتا تھا، اب جو اس کا مطالعہ شروع کیا تو محسوس ہوا کہ یہ کوئی صحیفہ نہیں، بلکہ علم و حکمت اور اسرارِ معرفت کی ایک دنیا ہے، یہ ایک ایسا سمندر ہے، جس کی نہ وسعت کا کوئی اندازہ ہے اور نہ جس کی گہرائی کی کوئی حد ہے، اس کی وسعتیں بے اندازہ اور گہرائیاں بے پایاں ہیں، اس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا:

زانجم تا بہ انجم صد جہاں بود ۔۔۔ خرد ہر جا کہ پر زد آسماں بود
ولیکن چوں بخود نگریستم من ۔۔۔ کراں بے کراں در دے نہاں بود

اور اگر چاہو تو اکبر الٰہ آبادی کے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہو:

چشمِ معنی سے جو کی سیرِ مقاماتِ قرآں! پتہ پتہ مجھے اک گلشن شاداب ہوا
قطرہ قطرہ میں ہوئی وسعتِ دریا پیدا ذرہ ذرہ صفتِ مہر جہاں تاب ہوا

ہمارے ان تمام ہی ساتھیوں کا کہنا ہے کہ پہلے قرآن پاک سے ہمیں اس حیثیت سے محبت تھی کہ وہ ہمارے محسن رب کی کتاب ہے، اس کی قدردانی ہمارا فرض ہے، اس کا حق ہے کہ وہ سرآنکھوں پر رکھی جائے، مگر اس کے اندر حسن وجمال کے جو لاتعداد جلوے تھے، لالہ وگل کے جو بے شمار تختے تھے، آفتاب و ماہتاب کے جو ان گنت قافلے اور پروین وکہکشاں کے نہ جانے کتنے کارواں تھے، ان سے نگاہیں ناآشنا تھیں، مگر جب ہم نے تفاسیر فراہیؒ کی چاندنی میں یا اس کے دیے ہوئے اصولوں کی روشنی میں اس "تاج محل" کا مشاہدہ کیا، تو اس کے محاسن اتنی کثرت سے بے نقاب ہونے لگے اور حسن وجمال کے اتنے جلوے سامنے آنے لگے کہ عقل حیران رہ گئی ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن دراصل علم وحکمت کا ایک ایسا چمن ہے کہ جس گوشہ میں بھی کھڑے ہو جائیے گھنٹوں کھڑے رہیے، ہر گوشے میں جلووں کی اتنی بہتات ہے کہ ان کو چھوڑ کر آگے بڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی، اب ہماری سمجھ میں آیا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے صرف سورۃ "بقرہ" کے مطالعہ میں مکمل بارہ۱۲ سال کیسے صرف کر دیے، یا صحابہ وتابعین نماز میں ایک ہی آیت کو رات رات بھر کیوں کر دہراتے رہ جاتے تھے، اللہ اکبر!! اس چھوٹی سی کتاب میں اس

حکیم مطلق نے کیا کچھ نہیں رکھ دیا ہے آنکھوں کی ٹھنڈک اور رُوح کی طراوت کا وہ کون سا جلوہ ہے، جس سے یہ چمن خالی ہو! راحت وشادمانی کی وہ کون سی بہاریں ہیں، جن کے قافلے یہاں موجود نہ ہوں ؎

ہٹتی ہی نہیں اب ترے جلووں سے نگاہیں ÷ آنکھوں کو بڑی دیر میں آداب نظر آئے

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو "نور" اور "ضیاء" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ گویا وہ نور کا سرچشمہ اور روشنی کی جوئے رواں ہے اور اسی لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی "سراجاً منیراً" یعنی مہر درخشاں کہا گیا ہے، ہمارے ان معزز ساتھیوں کا بیان ہے کہ ان صفات پر ہم پہلے ایمان تو رکھتے تھے، مگر ان کی حقیقت سے نا آشنا تھے، ہم یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ قرآن پاک کو "نور کا سرچشمہ" کیوں کہ کہا گیا ہے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ میں ان باتوں پر ہمارا ایمان تو تھا، مگر "اطمینان" نہ تھا، مگر جب ہم نے "تفاسیر فراہیؒ" کو بار بار بغور پڑھا اور امام فراہیؒ کے دریافت کردہ اصولوں کی روشنی میں کتاب الٰہی کا مطالعہ کیا تو دل سے بے اختیار یہ صدا نکلی ؎

تو خورشیدی و من سیارۂ تو ÷ سراپا نورم از نظارۂ تو

یقیناً قرآن پاک نور کا سرچشمہ اور روشنی کی جوئے رواں اور اس کتاب کا لانے والا بھی حقیقی معنوں میں ایک مہر درخشاں تھا۔

قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ نے "مبارک" یعنی برکتوں کا خزانہ فرمایا ہے، ہمارے دوستوں کا تاثر ہے کہ پہلے ہمارے لیے یہ سمجھنا بے حد دشوار تھا کہ قرآن پاک برکتوں کا خزانہ کیسے ہے؟ مگر اب اس کان معرفت کے چند ذرے مل جانے

کے بعد سے بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

سفالم را مئے تو جامِ جم کرد — درونِ قطرہ ام پوشیدہ یم کرد

یہ کیفیت کہاں سے پیدا ہوئی ؟ اس کانِ معرفت اور چمنستانِ حکمت کی سیر کس نے کرائی ؟ ہمارے ساتھیوں کا تاثر بھی ہے کہ یہ سب "تفاسیرِ فراہیؒ" کا فیض ہے، تفاسیرِ فراہیؒ کے مطالعہ سے پہلے ہم نے کتنی ہی تفاسیر کا مطالعہ کیا، مگر اس وقت ہماری کیفیت اس مسافر کی سی تھی جو بیتابیٔ شوق میں صحرا پر صحرا طے کیے جا رہا ہو، مگر منزل کا کہیں پتہ نہ ہو، بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہو کہ وہ جوں جوں آگے بڑھتا جا رہا ہو، منزل اس سے دور بھاگ رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ امام فراہیؒ کی تربت ٹھنڈی رکھے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے کہ ان کی رہنمائی میں یہ راہ بڑی آسان ہو گئی، راستے کی جو مسافت ختم ہونے پہ نہیں آتی تھی، وہ طویل مسافت حیرت انگیز طور پہ سمٹ کر رہ گئی، تفاسیرِ فراہیؒ نے ہمیں قرآن پاک کا لذت آشنا بنایا اور اس بحرِ حکمت میں غواصی کا سلیقہ سکھایا، اس نے نقطۂ نظر کی اصلاح بھی کی، اور فکر و نظر کو وسعت بھی دی، اس نے تحقیق کا ذوق بھی دیا اور تحقیق کے لیے ایک وسیع دنیا بھی دی، اس طرح ذاتی تجربات کی روشنی میں پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سارے طلبۂ قرآن جو قرآن پاک سے محبت رکھتے اور اس کے بحرِ حکمت سے سیراب ہونا چاہتے ہیں، اگر وہ مروجہ تفاسیر کے اندر اپنے لیے کوئی رہنمائی نہیں پاتے تو وہ بھی فہمِ قرآن کی یہی راہ اپنائیں، وہ امام فراہیؒ کی ان محققانہ اور بصیرت افروز تفاسیر کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں، اگر خدائے تعالیٰ

کی توفیق شاملِ حال رہی تو ہمیں اُمید ہے کہ وہ بڑی آسانی سے یہ راہ طے کرلیں گے، اس راہ میں ان کا جو قدم بھی اُٹھے گا، وہ انھیں منزل سے قریب کرے گا، اور وہ ایک طویل اور لاحاصل سفر کی جانکاہ مشقتوں سے راحت پاجائیں گے۔

زندگی اور حرارت

امام فراہیؒ کے ہاں ہمیں ایک اور بھی امتیاز نظر آتا ہے، جو انھیں اپنے پیش رو مفسرین سے ممتاز کردیتا ہے، امام فراہیؒ کے ہاں خشکی اور افسردگی نہیں پائی جاتی، بلکہ کیف و سرور اور زندگی و تازگی پائی جاتی ہے، ان کی تفسیر "کافیہ" اور "سلّم" کی شرح نہیں معلوم ہوتی، بلکہ ایک زندہ اور پرسوز دل سے اُبلی ہوئی موجِ نور یا بربطِ وحی کا سازِ پرکیف معلوم ہوتی ہے، وہ خالص علمی دنیا کی ایک لاحاصل سیر نہیں معلوم ہوتی، بلکہ رزم گاہِ حیات کی تاریکیوں میں روشنی دکھانے والی ایک قندیل معلوم ہوتی ہے، قرآن پاک خالص علمی و تحقیقی ریسرچ کا موضوع بننے کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ وہ ایک زندہ اور تیز گام انسانی معاشرے کی فکری و عملی رہنمائی کے لیے آیا ہے، مولانا فراہیؒ کی تفاسیر میں قرآن پاک بالکل اسی حیثیت میں نظر آتا ہے، اس کی یہ حیثیت کہیں بھی مجروح نہیں ہونے پاتی، وہ جس سورہ کی بھی تفسیر کرتے ہیں، حلِ لغات اور توضیحِ مطالب کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتے چلتے ہیں کہ زندگی کے عملی مسائل کے لیے اس سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے، وہ خرد کی گتھیوں کو کس طرح سلجھاتی اور ذہن کی الجھنوں کو کس طرح دُور کرتی ہے۔

تفاسیر فراہیؒ مسائل حیات کی ایک تشریح

ان کی تفسیر صحیح معنوں میں مسائل حیات کی تحلیل و تشریح اور رجہاد زندگانی میں کام آنے والی ایک شمشیر معلوم ہوتی ہے، اس سے بیک وقت رُوح میں بیداری، ذہن میں روشنی، علم میں ترقی، ایمان میں تازگی اور عمل میں چستی پیدا ہوتی ہے، بہتر ہوگا کہ اس موقع پر ہم تفاسیر فراہیؒ کے کچھ نمونے یا اس کے چند اقتباسات بھی پیش کرتے چلیں کہ اس سے ہماری بات سمجھنے میں آسانی ہوگی اور تفاسیر فراہیؒ کی یہ خصوصیت روشن ہو کر سامنے آجائے گی۔

اس وقت ہم بطور مثال استاذ امام کے ایک رسالہ تفسیر سورۂ "والعصر" کو سامنے رکھتے ہیں، امام موصوفؒ نے اس چھوٹی سی سورہ کی تفسیر میں کتنے قیمتی نکتے بیان فرما دیے ہیں، ہمارے ذہن کی کتنی گرہیں کھول دی ہیں، عملی زندگی کے کتنے مسائل حل کر دیے ہیں، ایمان و عمل کی حقیقت اور ان کے باہمی ربط کو کس طرح بے نقاب کر دیا ہے، ایمان سے متعلق جن مسائل میں لوگ شروع سے ابجھتے چلے آئے ہیں ان کو کتنی خوبصورتی سے سلجھا کر رکھ دیا ہے، اس کا صحیح اندازہ تو اس تفسیر کے مطالعہ ہی سے کیا جاسکتا ہے ویسے سرسری اندازے کے لیے ہم اس کے مضامین کی فہرست آپ کے سامنے پیش کیے دیتے ہیں۔

(۱) سورہ کی دو تاویلیں (۲) سورہ کا اجمالی مفہوم اور ماقبل سے تعلق (۳) لفظ عصر کی تحقیق (۴) زمانہ کی قسم کیوں کھائی گئی (۵) لفظ وَتَوَاصَوْا سے خلافت کا وجوب۔

(۶) "حق" و "صبر" کی شرح اور ان کا باہمی تعلق (۷) سورہ کی وسیع تاویل اور جوامع الکلم میں سے ہونے کی وجہ (۸) ایمان کا حقیقی مفہوم (۹) ایمان کے خاص معنی اور اس کا سیاسی مفہوم (۱۰) عمل صالح کی حقیقت (۱۱) حق ہمارے عروج کی غایت ہے۔
(۱۲) حق و صبر کی توضیح اور ان کا باہمی تعلق (۱۳) عمل اور تواصی کا باہمی تعلق (۱۴) فرض دعوت اور آزادیٔ قول (۱۵) حق و صبر کی مزید توضیح (۱۶) سورہ کا تعلق ماقبل و مابعد سے۔

ان عنوانات کے تحت مولانا نے کس انداز سے گفتگو فرمائی ہے اور کتنی حقیقت افروز بحثیں کی ہیں، اس کا اندازہ کرانے کے لیے ہم کتاب کی ایک فصل بھی یہاں پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں "زمانے کی قسم کیوں کھائی گئی؟" اس عنوان کے تحت امام موصوف لکھتے ہیں:

سورہ "عصر" میں زمانہ کی قسم کیوں کھائی گئی؟

"لوگوں کو معلوم ہے کہ پچھلی قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے نافذ ہوئے، وہ ٹھیک ٹھیک ان کے اعمال کا بدلہ تھے، اگر انھوں نے نیکیاں اور بھلائیاں کیں، خدا نے ان کو عروج و کمال بخشا۔ اگر انھوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی، قانونِ الٰہی نے انھیں تباہ و برباد کر دیا۔ انہی حقائق کو یاد دلانے کے لیے خدا نے زمانے کی قسم کھائی، کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک دن اعمال کی اس حقیقت سے لازماً ان کو بھی دوچار ہونا ہے پھر زمانے کی قسم میں ایک اور نازک نکتہ بھی مضمر ہے، وہ یہ کہ انسان کا اصل راس المال زمانہ ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ تیز روی اور برق رفتاری میں

کوئی چیز بھی اس سے بڑھ کر نہیں، لیکن یہ انسان کی کیسی نادانی ہے کہ وہ زمانے کی اس بے وفائی سے واقف ہونے کے باوجود اس پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی زندگی کی بے ثباتی، روز قیامت کی بازپرس اور جزائے اعمال کے قانون سے بالکل غافل ہے، اس معاملہ میں انسان کی مثال بالکل اس تاجر کی ہے جو برف کی تجارت کرتا ہے، لیکن بجائے اس کے کہ اس کو جلد سے جلد بیچ کر اپنے دام وصول کرنے کی فکر کرے، اس کو اس نے رکھ چھوڑا ہے اور اس کی چمک اور ٹھنڈک کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے تاجر کو بہت جلد اپنی غفلت و نادانی پر کف افسوس ملنا پڑے گا۔ ٹھیک یہی حال اس غافل انسان کا ہے جو وقت کی قدر و قیمت سے غافل ہے، جب موت کی گھڑی اس کے سر پر آجائے گی، حسرت و نامرادی کے سوا اس کے جیب و دامن میں کچھ نہ ہوگا، قرآن مجید جس نامرادی کا بار بار ذکر کرتا ہے، اس کی حقیقت یہی ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰي مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰي ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۝

(بے شک وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنھوں نے اللہ کے سامنے حاضر ہونے کو جھٹلایا یہاں تک کہ جب قیامت کی گھڑی ان کے سر پر

دفعۃً آجائے گی، وہ کہیں گے، افسوس ہماری کوتاہی پر جو اس باب میں ہم سے ہوئی ہے اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے ہوں گے اور آگاہ! کہ وہ برا بوجھ ہوگا، اور نہیں ہے دنیا کی زندگی، مگر لہو و لعب اور یقیناً دار آخرت بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو پرہیزگاری کی راہ اختیار کریں۔)

اور یہ جو قسطلانی وغیرہ بعض علما نے "والعصر" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "اقسم بالدھر لاشتمالہ علی العجائب والعبر" زمانہ کی قسم اس لیے کھائی کہ وہ گوناگوں نیرنگیوں اور عبرتوں کا مجموعہ ہے، تو ان کا مطلب بھی وہی ہے، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

علاوہ بریں زمانہ کی تیز روی میں ایک پہلو بشارت اور تقویت صبر کا بھی ہے، کیونکہ اسی تھوڑی سی گزر جانے والی مدت کے صلہ میں اگر انسان چاہے تو اجر و ثواب کا ایک لازوال خزانہ حاصل کر سکتا ہے، ایک بدبخت انسان اس حیات چند روزہ کی فانی لذتوں پر ریجھ کر ابدی مسرت و کامیابی سے محروم ہو جاتا ہے، لیکن ایک عاقل اس فانی زندگی کے چند دنوں کے اندر، جن کی حقیقت ایک خواب یا برق خاطف سے زیادہ نہیں، تقویٰ اور ضبط نفس کی آزمائشیں جھیل کر اور اس باطل فانی سے بے نیاز اور اس حق باقی پر ثابت قدم رہ کر، جو آنکھوں سے اوجھل ہے، خدا کی خوشنودی اور محبت کا ابدی تخت و تاج حاصل کر لیتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہُوا کہ لفظ عصر محض بطریق مثل ہی نہیں آیا ہے، بلکہ یہ قانون جزا اور غفلت سرشت انسانوں کی نامرادی پر ایک محکم حجت ہے اور اس کے ساتھ ہی اس میں تقویت صبر و تقویٰ کا بھی ایک پہلو ہے، غور کرو، قرآن کے ایک لفظ نے کس خوبی اور ایجاز کے ساتھ فوز و فلاح اور خسران و نامرادی کے دونوں پہلو بے نقاب کر دیے ہیں۔

سورۃ والعصر کی تفسیر سارے ہی مفسرین نے لکھی ہے، اس سورہ میں زمانے کی قسم کیوں کھائی گئی ہے؟ اور اس کا مطلب کیا ہے؟ اس پر بھی سبھی لوگوں نے کچھ نہ کچھ روشنی ڈالی ہے، اس سلسلہ میں مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے اور اس لفظ کی جو تفسیر و تاویل اور جو تشریح و توجیہ کی ہے، ان سب کو دیکھ ڈالو، پھر امامؒ کے رسالہ کی اس فصل کو پڑھ ڈالو، امام موصوف کی انفرادیت خود نمایاں ہو کر سامنے آجائے گی، اور تمہیں بخوبی اندازہ ہو جائے گا، کہ دیگر تمام تفاسیر کے مقابلہ میں تفاسیر فراہیؒ کو کیا امتیاز حاصل ہے۔

تفاسیر فراہیؒ کا اثر علمی حلقوں پر

یہی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے تفاسیر فراہیؒ کو اہل علم اور ارباب فضل و کمال نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور جوہر شناس نگاہوں میں اسے وہ مقام حاصل ہُوا، جو کسی بھی دوسری تفسیر کو نہ حاصل ہو سکا، تفاسیر فراہیؒ نے علمی حلقوں میں خاصا گہرا اثر چھوڑا، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کے بعد سے تفسیر و تاویل

کے باب میں ارباب فکر و نظر کا طرزِ فکر اور نقطۂ نظر ہی بدل گیا، چنانچہ بعد میں ہندو پاک میں جتنی بھی قابلِ ذکر تفسیریں لکھی گئیں، ان سب کا انداز بدلا ہوا نظر آئے گا، ان سارے ہی مفسرین نے امام فراہیؒ کے فکر سے استفادہ کرنے اور ان کے اصولوں کی رعایت کرنے کی کوشش کی، انھوں نے اسی نہج کو اپنانے کی کوشش کی جس نہج پر امام فراہیؒ نے اپنی تفسیر لکھی ہے، چنانچہ قدماء کے ہاں آیات کے اندر ربط و نظم کا تذکرہ بہت کم پاؤ گے، مگر ان کے بعد کی تفسیروں میں جگہ جگہ ربط و نظام اور سیاق و سباق کے تذکرے ملیں گے، ان مفسرین نے اپنی حد تک آیات اور سورتوں کو مربوط کرنے اور ان کی تفسیر میں سیاق و سباق کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے، قدماء نے عموماً اپنی تفاسیر کی بنا روایات پر رکھی ہے اور اس میں انھوں نے اس حد تک غلو کیا ہے کہ قوی و ضعیف اور صحیح و سقیم کی بھی تمیز اٹھا دی ہے، روایت کے نام پر آنے والی ہر چیز کو انھوں نے مرحبا کہا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ آنے والی چیز قرآن پاک سے ہم آہنگ ہوتی ہے یا نہیں، مگر ان بعد کی تفسیروں میں تم یہ انداز نہیں پاؤ گے۔ امام فراہیؒ کی طرح یہ مفسرین بھی براہِ راست قرآن پاک پر غور کرتے اور خود آیات کی ہی روشنی میں آیات کو سمجھنے کی سعی کرتے ہیں وہ اگر روایات کو قبول کرتے ہیں تو انہی آیتوں کی روشنی میں قبول کرتے ہیں، اگر آیات کے اسلوب اور ان کے الفاظ میں ان روایات کے لیے گنجائش ہوتی ہے تو قبول کرتے ہیں، ورنہ ان کے سلسلہ میں احتیاط سے کام لیتے ہیں، اسی طرح امام فراہیؒ کی طرح ان مفسرین نے بھی قدماء کی طرح غیر مفید بحثوں میں الجھنے کے بجائے زندگی کے واقعی

مسائل کے لیے قرآن پاک سے اکتساب نور کیا ہے۔

ان مفسرین سے ہمارا اشارہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی طرف ہے، یہ چاروں مفسرین فراہی اسکول کے دلدادہ اور فکر فراہیؒ کے قدرداں ہیں، یہ گو اپنے ذوق طبیعت اور رتبہ و منزلت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہیں، مگر بنیادی طور پر یہ سب اسی آفتاب علم سے اکتساب فیض کرتے نظر آتے ہیں، ہر صاحب نظر اس کو واضح طور پر محسوس کرتا یا کر سکتا ہے کہ یہ مفسرین اپنے فکر اور نقطۂ نظر میں امام فراہیؒ سے کافی متاثر ہیں۔ مولانا آزادؒ کی تفسیر ترجمان القرآن ہو یا مولانا مودودی کی تفہیم القرآن، مولانا دریابادی کی تفسیر ماجدی ہو یا مولانا اصلاحی کی تدبر قرآن، ہر ایک کے اندر بین طور پر تمہیں فکر فراہیؒ کی جھلک نظر آئے گی یہی وجہ ہے کہ یہ تفاسیر اپنی خصوصیات اور اپنے اسلوب و انداز کے لحاظ سے قدیم تفاسیر سے یکسر مختلف ہیں، اس طرح امام فراہیؒ نے ہندو پاک میں جو قرآن فہمی کا ذوق پیدا کیا ہے، تفسیر قرآن کے باب میں علمی حلقوں پر جو اپنی چھاپ ڈالی ہے اور ذہنوں میں جو وسعت اور فکر و نظر میں جو گہرائی پیدا کی ہے، اس کے لحاظ سے ہم بے تکلف کہہ سکتے ہیں کہ ؎

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں ؛ ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

یا اسی کو چاہو تو یوں بھی کہہ سکتے ہو ؎

عجم از نغمہائے او جواں شد ‌ ‌ ‌ زسودا یش متاع او گراں شد
ہجومے بود رہ گم کردہ در دشت ‌ ‌ ‌ ز آواز درایش کارواں شد

ہوسکتا ہے یہاں تمہیں تعجب ہو کہ ہم نے ان اساطین کے بارے میں یہ دعویٰ کیسے کر دیا کہ یہ سب فکرِ فراہیؒ سے متاثر ہیں۔

مولانا آزادؒ

جہاں تک مولانا آزادؒ کا تعلق ہے، تو ان کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ جس زمانہ میں ندوہ سے مولانا شبلی نعمانی رسالہ "الندوہ" نکالتے تھے، اس زمانہ میں کچھ عرصہ تک مولانا آزاد بھی ندوہ میں مقیم رہے اور رسالہ کے معاون اڈیٹر کے فرائض انجام دیتے رہے، اسی زمانہ میں ان کا علامہ فراہیؒ سے تعارف ہوا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی حیاتِ شبلی میں لکھتے ہیں:

"ندوہ میں مولانا آزاد نے مولانا حمید الدین فراہیؒ صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کیے، جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں بھی سرایت کر گیا اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر الہلال میں نظر آیا۔"

اسی طرح رسالہ معارف شمارہ نمبر ۱ جلد ۲۷ میں سید صاحب لکھتے ہیں:...

مولانا شبلیؒ کے اصرار سے کئی دفعہ مولانا فراہیؒ ندوہ میں آ کر رہے اور طلبہ کو کبھی فلسفۂ جدیدہ اور کبھی قرآن کے سبق پڑھائے، میں بھی اس زمانہ میں ندوہ کا طالب علم تھا، مولانا کے ان درسوں سے مستفید ہوا۔

اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد مولانا شبلی مرحوم کے پاس ندوہ میں مقیم تھے اور الندوہ کے مددگار اڈیٹر تھے، وہ مولانا حمید الدین صاحب کی ان

صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے اور قرآن پاک کے درس و نظر کے نئے راستوں کے نشان پانے لگے اور بالآخر الہلال کے صفحات میں اس جادہ پیمائی کے مختلف مناظر سب کی نظروں کے سامنے آ گئے ......"

الہلال کے بارے میں جب سید صاحب کا یہ تأثر ہے کہ اس کے صفحات میں امام فراہیؒ کا رنگ نمایاں تھا تو پھر ان کی گراں قدر تفسیر "ترجمان القرآن" کے بارے میں ہمیں یہ ثابت کرنے کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں کہ اس پر بھی فکر فراہیؒ کی چھاپ پڑی ہے، یہ حقیقت ہے کہ مولانا آزادؒ امام فراہی کی بےمثال عبقریت، غیر معمولی فہم و بصیرت، ان کی نکتہ رسی، ژرف نگاہی، علمی گہرائی فکر و نظر کی سلامتی، اور تقویٰ و پارسائی سے حد درجہ متاثر تھے، جس کا انھوں نے کھل کر اعتراف بھی کیا ہے، بلکہ انھوں نے اپنے زمانۂ قلندری" میں امام فراہیؒ سے یہ طے بھی کیا تھا کہ وہ اگر امام فراہیؒ کی صحبت میں رہیں گے، ان سے اکتساب فیض کریں گے اور امام موصوف جن خطوط پر اور جن اصولوں کی روشنی میں قرآن پاک کی تفسیر لکھنی چاہتے ہیں. نیز قرآن پاک کی روشنی میں وہ علوم قدیمہ کی تطہیر اور علوم جدیدہ کی اصلاح کا جو پروگرام رکھتے ہیں، اس کی تکمیل میں مدد دیں گے، مگر پھر وہ سیاست کی زلف دراز میں اُلجھ کر رہ گئے اور اس منصوبے کی تکمیل نہ کر سکے، بعد میں امام فراہیؒ نے انھیں ان کا یہ وعدہ معاہدہ یاد بھی دلایا مگر انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ "اب میں سیاست کے گرداب میں پھنس چکا ہوں"۔

مولانا مودودی اور مولانا دریابادی

جہاں تک مولانا مودودیؒ اور مولانا دریابادیؒ کا تعلق ہے تو یہ لوگ مولانا کے کتنے عقیدتمند اور تفسیر قرآن کے باب میں ان کی ژرف نگاہی، نکتہ رسی اور معنی آفرینی کے کس درجہ قائل ہیں، وہ ان کے انداز تفسیر وطرز تاویل کے کتنے مداح وثناخواں ہیں، اس کا تذکرہ ہم پیچھے کر آئے ہیں، امام فراہیؒ کے بارے میں ان دونوں بزرگوں نے اپنے جن گہرے تاثرات کا اظہار کیا ہے، وہ ہمارے اس دعوے کی روشن دلیل ہے، یہ دونوں بزرگ علامہ فراہیؒ سے کس حد تک متاثر تھے، ان کے ذہن ودماغ اور ان کی شخصیتوں پر ان کی کتنی گہری چھاپ پڑی تھی، اس کا اندازہ کرنے کے لیے درج ذیل تحریریں بھی سامنے رکھی جاسکتی ہیں، ایمان واسلام کے "ٹھیکیداروں" نے جب علامہ شبلیؒ اور علامہ فراہی پہ کفر کے فتوے لگائے اور ان دونوں بزرگوں کے خلاف طوفان بدتمیزی کھڑا کیا، تو جن بزرگوں کی حمیت ایمانی نے کھل کر اس فتنہ کا مقابلہ کیا، ان میں مولانا مودودی بھی تھے، وہ علامہ فراہی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دوسرا شخص وہ ہے جس نے مسلسل چالیس برس تک قرآن مجید کی خدمت کی، جس نے معارف قرآنی کی تحقیق میں سیاہ بالوں کو سفید کیا، جس کی تفسیروں سے عرب وعجم کے ہزاروں مسلمانوں میں تدبر فی القرآن کا ذوق پیدا ہوا، جس کی تحریروں کا ایک ایک لفظ گواہی دے رہا ہے کہ وہ قرآن کا عاشق ہے اور اس کے لفظ لفظ پر

جان نثار کرتا ہے۔"

(ملاحظہ ہو "دو عمدہ مضمون" مطبوعہ الاصلاح، ص: ۱۲)

پھر ایک دوسرے موقع پر مولانا تفاسیر فراہیؒ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سلسلۂ تفاسیر فراہیؒ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ اس کے جس جزء کو بھی پڑھیں گے، وہ آپ کو صرف اسی سورہ کے معنی و مطلب سے آشنا نہ کرے گا، جس کی تفسیر اس جزء میں کی گئی ہو، بلکہ اس کے ساتھ ہی پورے قرآن کو سمجھنے کے لیے آپ کو بہت سی اصولی معلومات بھی دے گا، تحقیق کے نئے راستے دکھائے گا، تدبر فی القرآن کے نئے نئے دروازے کھولے گا۔

(ترجمان القرآن ج ۱۹ عدد: ۴، ۶/۵)

مولانا دریابادی اپنے معاصرین کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"لکھنؤ میں مولانا شبلی کے ہاں ملاقات ہوتی، آدمی کم سخن و کم آمیز تھے، میں اس وقت ملحد اور وہ سخت دیندار، البتہ ۱۷ء یا ۱۸ء میں حیدرآباد میں مہینوں ان کا ساتھ رہا۔ ان کی خوش دماغی اور وقت نظر کے جوہر کھلے۔"

پھر ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اس دور میں (۱۹۱۹ء سے پہلے) دو یا تین زندہ ہستیاں بھی ایسی تھیں جن سے طبیعت رفتہ رفتہ اور بہت تدریجی ارتقاء سے سہی،

لیکن بہر حال اصلاحی ہی اثر قبول کرتی رہی، ایک اُردو کے مشہور کلیم و ظریف شاعر اکبر الہ آبادی ہیں، دوسرے کامریڈ کے ایڈیٹر، اس وقت کے مسٹر اور اسی درمیان میں مولانا ہو جانے والے محمد علی، ان دو کے بعد ہلکا ہلکا اثر مولانا حمید الدین مفسر قرآن کا بھی پڑتا رہا۔"

(ملاحظہ ہو "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" ص: ۵۰)

پھر ان بزرگوں کی تفسیروں کا مطالعہ کرتے وقت بھی ہمیں یہ چیز واضح طور پر محسوس ہوتی ہے، یہ لوگ جگہ جگہ امام فراہیؒ کی تحقیقات اور ان کے تفسیری نوٹس سے استفادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی

جہاں تک مولانا امین احسن اصلاحی کا تعلق ہے، تو ان کے بارے میں سبھی کو معلوم ہے کہ وہ براہِ راست علّامہ فراہیؒ کے شاگرد ہیں، وہ کئی سال ان کی صحبت میں رہے ہیں، ان سے خصوصی طور سے مستفید ہوئے ہیں، چنانچہ وہ جگہ جگہ اپنی تفسیر میں اعتراف کرتے ہیں کہ "تدبر قرآن" کی شکل میں اگر قرآن پاک کی کوئی خدمت انجام پائی ہے، تو یہ سر تا سر استاذ امامؒ کی صحبت و تربیت اور ان کے فیضان نظر کا کرشمہ ہے۔

یہ چاروں مفسرین گرچہ مکمل طور پر فکر فراہی کے نمائندے نہیں کہے جا سکتے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان سب نے اپنے اپنے ذوق و طبیعت اور وسعت و مقدرت کے لحاظ سے اس آفتاب علم سے اکتساب نور کیا ہے، مولانا امین احسن

اصلاحی نے چونکہ استاذ امام کی زیادہ صحبتیں اٹھائی ہیں، ان سے اکتساب فیض کے مواقع انھیں زیادہ حاصل ہوئے ہیں، اس لیے ان کی تفسیر "تدبر قرآن" کے بارے میں بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ صحیح معنوں میں اس فکر کی حامل اور اس تفسیری اسکول کی نمائندہ ہوگی، مگر اس فکر کی نمائندگی کے لیے جو فرصت و فراغت اور جو یکسوئی درکار تھی، وہ شاید حاصل نہ ہو سکی، اسی لیے اگرچہ ہم اس عظیم تفسیر کے خوشہ چیں اور جان و دل سے اس کے قدرداں ہیں، مگر اس کے بارے میں ہم نے پہلے جو تصور قائم کیا تھا، اس سے اسے بہت مختلف پایا۔

ضرورت ھے

ضرورت ہے کہ کچھ ذہین اور حوصلہ مند طلبہ قرآن خالص اجر آخرت کی نیت سے اس عظیم اور مہتم بالشان تفسیری اسکول کی نمائندگی و ترجمانی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، فکر فراہی کو وہ اپنی تحقیق و ریسرچ کا موضوع بنائیں اور امام فراہیؒ جو نقش ناتمام چھوڑ گئے ہیں، اس کے اتمام و تکمیل کے لیے جدّ و جُہد کریں، اگر یہ کام انھوں نے کر لیا تو یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہوگا، جسے علمی دنیا ہمیشہ قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھے گی اور ملت اسلامیہ کبھی ان کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکے گا۔

اساتذۂ تفسیر سے گذارش

ساتھ ہی ہم اپنی دینی درسگاہوں کے اساتذۂ تفسیر سے گذارش کریں گے

کہ وہ امام فراہیؒ کی بیش قیمت قرآنی تحقیقات کی قدر کریں، وہ انھیں مسلسل نظر انداز نہ کریں کہ علمی نقطۂ نظر سے یہ ان کی بہت بڑی محرومی ہوگی، ہماری ملت کے دیدہ وروں نے جس فراخ دلی سے ان کی قیمتی تحقیقات اور گراں قدر کاوشوں کا خیر مقدم کیا ہے، اسی فراخ دلی اور کشادہ ظرفی کے ساتھ وہ بھی ان کی تحقیقات کو مرحبا کہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے ان پر فہم قرآن کی جو راہ کھولی تھی، اس راہ کو اپنانے میں وہ پس وپیش نہ کریں کہ اس میں خود ان کا اپنا زیاں اور پوری ملت کا خسارہ ہوگا۔

آج تک ہماری درسگاہوں میں تعلیم قرآن کا جو نظام رائج چلا آرہا ہے، تجربات نے ثابت کردیا ہے، کہ وہ نظام بالکل ہی بے نتیجہ اور لاحاصل ہے، اس میں محض وقت کی بربادی اور نونہالان ملت کی صلاحیتوں کا ضیاع ہے، امام فراہیؒ نے مطالعۂ قرآن، تدبر قرآن اور فہم قرآن کے لیے جو خطوط کھینچ دیے ہیں، ان خطوط پر چل کر ہم خود بھی قرآن پاک سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھائیں اور طلبہ کو بھی پورا پورا فائدہ پہنچائیں، ہم خود بھی اس آفتاب حکمت سے روشنی حاصل کریں اور طلبہ کے دل ودماغ کو بھی اس کی لاہوتی کرنوں سے منور کردیں۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ
اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا؟

کیا یہ لوگ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے؟
کیا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہیں؟

سورۃ محمدؐ، آیت: ۲۴

ذکرِ منافقین؛

کچھ قرآن کے سلسلے میں

۱۔ قرآن پاک ایک ایسا کلام ہے کہ اسے نہایت کھلا اور آسان بھی کہہ سکتے ہیں اور نہایت چھپا اور مشکل بھی، خدائے پاک کو دیکھو کہ سب اسے جانتے ہیں اور پھر کوئی بھی نہیں جانتا، خود اپنے آپ کو سوچو کہ اور کسی چیز میں شک ہو تو ہو، مگر اپنی ہستی میں کبھی شک نہیں، مگر پھر دیکھو تو بقول غالبؔ ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

قرآن خود بھی اپنے تئیں کھلا اور آسان بتاتا ہے، مگر دوسرے لحاظ سے مستور و عمیق، اسی طرح خدائے پاک کہتا ہے کہ وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔

۲۔ ظاہر ہے کہ دو متناقض باتیں اگر ایک ہی جگہ پائی جاتی ہیں،

تو ضرور یہ اجتماع النقیضین دو مختلف پہلوؤں سے ہو گا، پس
قرآن پاک کا آسان اور مشکل دونوں ہونا ضرور دو حیثیت سے
ہو گا، چنانچہ ضروری اور عام تعلیم کے لحاظ سے وہ نہایت
آسان ہے، مگر اعلیٰ تعلیم اور دقیق مضامین کے لحاظ سے نہایت
مشکل ہے، اور یہی مناسب بھی ہے، کیونکہ جو لوگ اعلیٰ ترقی کی لیاقت
تک نہیں پہنچے ان کے لیے وہ مضامین اگر ظاہر بھی کر دیے جائیں
تو بھی نہ تو وہ اسے سمجھ سکیں گے اور نہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے،
بلکہ ان کے فائدہ اٹھانے کی قابلیت کو بھی نقصان پہنچے گا، یہ
اس لیے کہ دین کا راستہ سیرِ باطن ہے، سیرِ باطن تفکر اور تدبر سے
ہوتی ہے، اگر کسی شخص کو وہ باتیں جو وہ غور و فکر سے حاصل کر سکتا
ہے پہلے ہی بتا دی جائیں تو اس کی قوت فکر ضائع ہو جائے گی،
اور اس بتائی ہوئی بات کو بھی اس تیقن کے ساتھ نہیں سمجھے گا
جیسا کہ چاہیے اور آئندہ کی ترقی سے محروم رہے گا، اسی لیے
خدائے تعالیٰ نے نظام عالم میں کوشش کو ضروری قرار دیا، تاکہ
انسان اپنی اعلیٰ ترقی تک پہنچ سکے، تعلیم میں اس پہلو کا خیال رکھنا
نہایت ضروری ہے، ورنہ تعلیم ایک لفظ بے معنی ہو گا، کیونکہ
قوائے عقلیہ کے بے کار ہونے سے وہ علم بے ثمر ہو گا، یہ بات تو
علم ظاہری کی ہے، علم باطنی کو اس سے کچھ زیادہ خیال کر لو،
کیونکہ اس میں "جاننا" اسی کا نام ہے جس کو "ہونا" کہتے ہیں،

اچھی اور بری کو جاننا اور پھر رغبت اور نفرت کا نہ پیدا ہونا، یہ جاننا دیو، ہیں مسلم نہیں، حکیم بھی اگر محض نام کا حکیم نہیں تو ایسا ہی سمجھتا ہے، سقراط سر آمد حکمائے یونان کا یہی مذہب تھا اور وہ گناہ اور جہل کو ہم معنی کہتا تھا۔

۳۔ پس عام حکمت الٰہی کے موافق جس پر مدار ترقی انسانی ہے، قرآن کو محل تدبر اور تفکر بتایا گیا اور ظاہر کو بتا کر باطن کی طرف متوجہ کیا گیا، خداوند تعالیٰ ہم کو ابتدائی نعمتیں عطا کر کے انتہائی نعمتوں کی طرف رہبری کرتا ہے اور پھر جوں جوں ہم کوشش کرتے جاتے ہیں، انعام کے مستحق ہوتے جاتے ہیں اور یہی عدل ہے، ورنہ کیوں فرق مراتب ہے، پس اسی طرح فہم قرآن میں جوں جوں انسان ترقی کرتا جائے گا، اس پر اسرار کھلتے جائیں گے اور ایسے نمایاں طور پر کہ وہ ان کے سمجھنے اور ماننے پر مجبور ہوگا، پس درحقیقت یوں کہنا ٹھیک ہوگا کہ قرآن اپنے دقیق مضامین کے لحاظ سے بھی صاف اور آسان ہے اور اس کا چھپا ہونا محض اس بات کی خبر دیتا ہے کہ ابھی ہم پیچھے ہیں، چنانچہ خود قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ ”جو لوگ روشنی قبول کرتے ہیں، خدا ان کی روشنی کو زیادہ کرتا ہے۔“ عام تعلیم میں یہ بات نظر آتی ہے، کیسی ہی صاف تحریر ہو، ابجد خواں کے لیے وہ پیچیدہ ہے، مگر ایک ماہر کے نزدیک اس کو پیچیدہ کہنا صریحی ظلم ہوگا، قرآن نے اپنی

اس صفت کو کہ وہ ایک عمیق اور مکنون کلام ہے خود بتا دیا ہے، پیشانی کتاب پر تین حرف ایسے لکھ دیے کہ جن کے معنی اب تک باوجود اس قدر کوشش کے ظاہر نہ ہوئے، گویا کہ اس معنوی راہ کے اوّل ہی قدم پر یہ کتابہ لگا دیا کہ ع

ہشدار کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

اور نہ صرف اوّل ہیں بلکہ اور بھی جا بجا منزلوں کے سرے پر ایسی ہی کتابہ آویزاں کر دیا کہ مبادا اگر رہ گیر ایک جگہ بھول گیا تو دوسری جگہ ضرور خیال کرے۔

۴۔ پس قرآن نے صاف طرح پر اعلان کر دیا: "اس دریا سے بقدر اپنے ظرف کے پانی لے لو، تمام دریا کو اپنی کلھیا میں بھرنے کی ہوس نہ کرو"، صحابہؓ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے، اگر کسی جگہ کچھ سمجھ میں نہ آیا، تو خواہ مخواہ اس میں الجھتے نہ تھے، یہ اس لیے تھا کہ بقدر ہدایت قرآن نہایت کھلا تھا، دریا سے عبور کر کے اپنی منزل مقصود کو پہنچتے تھے مگر اس کی تمام وسعت کو ناپنے کی تمنّا نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ اسے غیر محدود اور ناپیدا کنار جان گئے تھے، ہاں ہر شخص بقدر اپنے فہم اور قوت فکر کے اس سے جواہر نکالتا تھا اور عام شاہراہ سے اِدھر اُدھر جو دلکش جزیرے واقع تھے ان کا انکشاف کرتا تھا، جیسا کہ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ "اس دریا کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے"۔

۵۔ جو لوگ قرآن کو ایک معمولی کلام خیال کرتے ہیں اور اپنی لیاقت کو جتنی ہے اس سے زیادہ سمجھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ فہم قرآن کے لیے کافی ہے، وہ قرآن کے معنی سے بالکل محروم رہتے ہیں، ان میں سے بعضے اپنی کج فہمی کا نام اعتراض رکھتے ہیں، دوسرے مذاہب والے جو قرآن کو کچھ تھوڑا بہت سمجھتے ہیں، وہ خود گواہی دیتے ہیں کہ اس کو سمجھنے کے لیے یہ پہلا امر ہے کہ اسے ایک اعلیٰ کلام مانا جاوے۔

قرآن پاک نے بھی اپنی نسبت مختلف جگہ یہی کہا ہے کہ "انکار کرنے والا اس کو ہرگز نہیں سمجھے گا" عیسیٰ علیہ السّلام سے جب ان کے شاگردوں نے پوچھا کہ بذریعہ تشبیہات کیوں تعلیم دیتے ہیں تو یہی فرمایا: "تاکہ یہ بات منکروں پر پوری ہو کہ سنتے ہیں اور نہیں سنتے اور دیکھتے ہیں اور نہیں دیکھتے، قرآن اپنی نسبت کہتا ہے کہ "اس سے بدکاروں کی گمراہی اور بڑھ جاتی ہے" چنانچہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا کہ حق کو جب ظاہر کیا گیا ہے تو وہ لوگ جو حق کو ماننے کے لیے آمادہ تھے انھوں نے بے تکلف اسے مان لیا اور حق کے راستہ پر چل کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ گئے، جس نے پس و پیش کیا اس نے اپنی منزل کھوئی اور جس نے منہ پھیر لیا وہ اندھا ہو گیا، کیونکہ جس عقل کو وہ ہر کام میں اپنا رہنما بنانا تھا جب اسی عقل نے حق کی گواہی دی تو وہ

اس سے بیزار ہُوا اور کہنے لگا کہ اس کلام میں جادو ہے کہ میری سمجھ الٹی ہُوئی جاتی ہے، پس عقل پر خواہش کو مقدم رکھا اور لگا فضول شبہے اور بے کار حیلے ڈھونڈنے تاکہ اپنی حماقت پر ذرا پردہ ڈال دے کیونکہ فطرت کو تاریکی سے خود نفرت ہے، پس جب اس نے اس طرح عقل کی آنکھ پر پٹی باندھ لی تو ظاہر ہے جو کچھ رہی سہی روشنی تھی اسے بھی کھو بیٹھا، اس حالت کو قرآن پاک نے اکثر جگہ بیان کیا ہے اور انجیل میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔

علّامہ حمید الدین فراہیؒ